طلوعِ اسلام

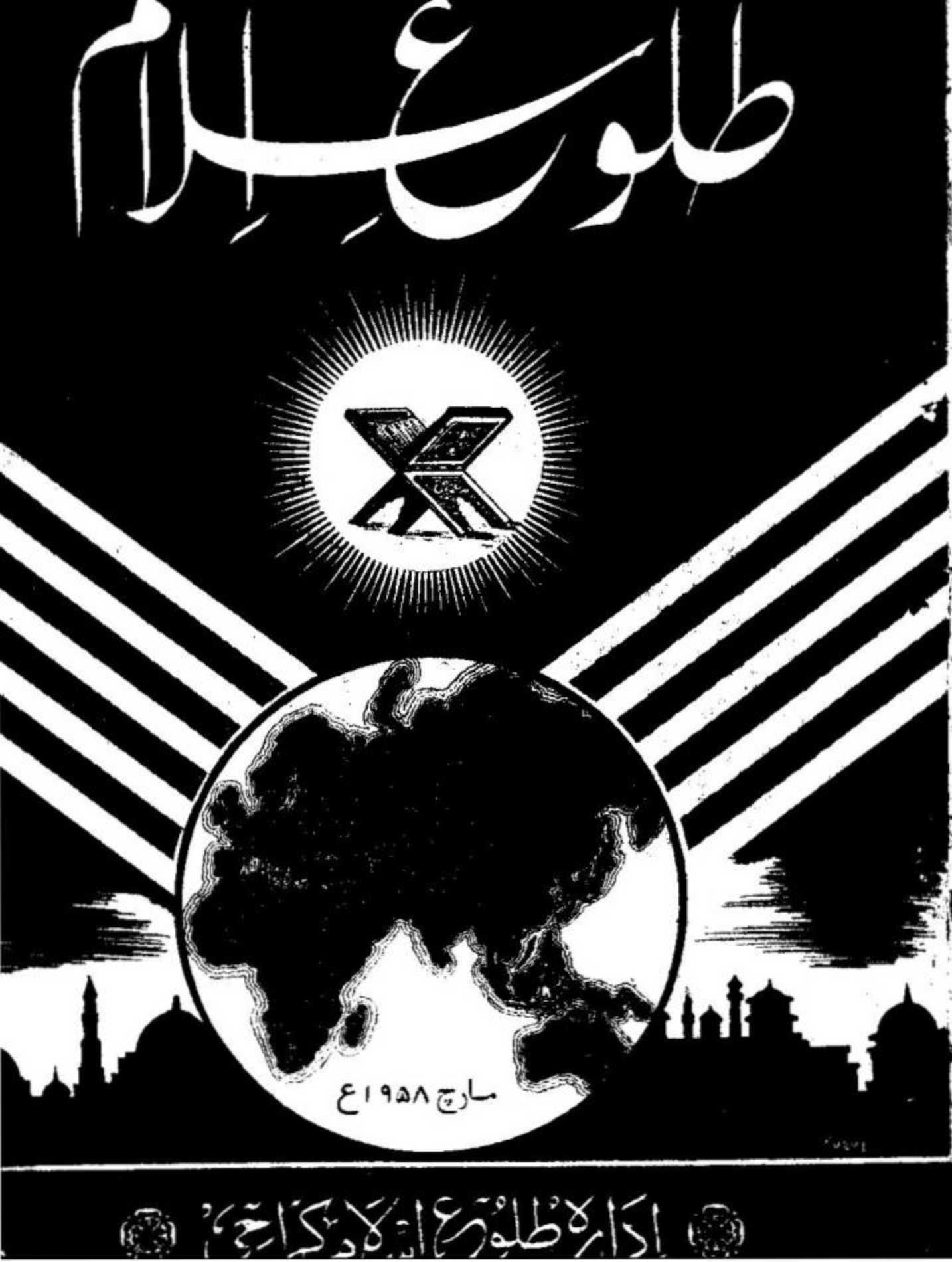

مارچ ۱۹۵۸ء

ادارہ طلوعِ اسلام لاہور کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک
ہندستان اور پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلی فون:۔ ۴۱۴۸۸
خط و کتابت کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۱۵۹/۳۔ ایل (پی ای سی ایچ سوسائٹی) کراچی ۲۹

جلد ۱۱ | مارچ سنہ ۱۹۵۸ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

لمعات ۲ — ۸

سلیم کے نام ۹ — ۱۸
(محترم پرویز صاحب)

اسلام میں زرعی زمین کا مسئلہ ۱۹ — ۲۲
(ڈاکٹر سید محمد یوسف صاحب)

مجلسِ اقبال ۲۳ — ۳۳

جماعت اسلامی ۳۴ — ۴۵

ریاست کا اسلامی تصور ۴۶ — ۵۲
(امین احسن اصلاحی صاحب)

اسلام میں فرد کے حقوق ۵۳ — ۵۸
(پروفیسر مہدی علام صاحب)

الدّینُ یُسرٌ ۵۹ — ۶۶
(شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی مرحوم)

رابطۂ باہمی ۶۷ — ۷۰

پیشکش برائے طباعت لغات القرآن ۷۱ — ۷۲

باب المراسلات ۷۳ —

حقائق و عبر ۷۴ — ۷۵

ادارہ طلوعِ اسلام — کراچی سے لاہور ۷۷ —

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زندگی کی ایک سطح وہ ہے جسے عام طور پر حیوانی سطح کہتے ہیں۔ اس میں مقصدِ حیات کھانے پینے اور افزائشِ نسل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہی وہ انسان ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) وہ حیوانوں کی طرح کھاتے پیتے اور سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس سے اوپر انسانی زندگی کی سطح ہے۔ اس سطح پر انسان کے سامنے زندگی کا مقصد حیوانی سطح سے بلند ہوتا ہے۔ وہ اس مقصد کی خاطر جیتا ہے، اسی کے حصول کے لئے تگ و تاز کرتا ہے اور (عند الضرورت) اس کے لئے جان تک دے دیتا ہے۔ اس مقصد کا تعین ان نظریات، تصورات اور معتقدات کی رو سے ہوتا ہے جو زندگی کی عمارت میں اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندہ قوموں میں یہ نظریات، صاف، واضح اور متعین ہوتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ابہام و التباس یا پیچیدگی اور الجھاؤ نہیں ہوتا۔ وہ جب اپنے کسی نظریہ کے متعلق بات کرتے ہیں تو انھیں علم اور یقین ہوتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نظریہ کا مفہوم و مطلوب کیا ہے اور ان کی عملی زندگی سے اس کا تعلق کیا۔ اس قوم کے افراد میں اس کے متعلق کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوتا۔ ان کے سامنے جب اس کا نام لیا جائے تو ان میں سے ہر فرد کے ذہن میں ایک ہی مفہوم آتا ہے۔ بعینہٖ جس طرح جب ہم (مثلاً) "پانی" کہتے ہیں تو اس سے ہر شخص ایک ہی مفہوم لیتا ہے۔

لیکن جب کوئی قوم زندگی اور حرارت سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کے ہاں اس کے نظریات و معتقدات کے الفاظ تو باقی رہ جاتے ہیں لیکن ان کا واضح اور متعین مفہوم کسی کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ ان کی حیثیت، قرآن کے الفاظ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ (۱۲/۴۰) "یونہی کچھ نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لئے"۔ انھیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ ان اسماء کا مسمّیٰ کیا ہے۔ یعنی جس مفہوم کی ادائیگی اور جس مقصد کے اظہار کے لئے یہ الفاظ تجویز کئے گئے تھے، وہ مفہوم اور مقصد کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ نظریات اور معتقدات جنھوں نے ان کی زندگی کی عمارت کا سنگِ بنیاد اور ان کے پیکرِ حیات کی جان بننا تھا جب ان کی یہ حیثیت رہ جائے تو اس قوم میں زندگی اور توانائی کہاں سے آسکتی ہے؟

وہ قوم ان الفاظ کی پرستش کرتی اور انہیں سینے سے لگائے لگائے پھرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ یہ بہت بڑے "ثواب" کا کام ہے۔ پھر اس قوم میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو جاتا ہے جو ان الفاظ کی حفاظت کا اجارہ دار بن کر عوام کے اس خیال کو سختہ سے پختہ تر کرتا رہتا ہے کہ مقصودِ زندگی انہی الفاظ کا تحفظ اور نصب العینِ حیات انہی بے جان پیکروں کا استحکام ہے۔ وہ انہیں اس قدر مقدس بنا کر دکھاتا ہے کہ عوام بے چارے اپنی خوش عقیدگی میں ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ہر آنے والی نسل ان الفاظ کو اپنے بزرگوں سے سنتی اور آنکھیں بند کر کے انہیں صحیح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ ان کے ہاں "مسلّمات" کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے متعلق اب کسی غور و فکر اور تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں یہ ابدی حقائق ہیں جنہیں علی حالہٖ تسلیم کر لینا تقاضائے ایمان ہے۔ جب کوئی قوم دو چار پشتوں تک اسی حالت میں رہے تو پھر انہیں اس دلدل سے نکالنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ مشہور مغربی مفکر وائٹ ہیڈ کا قول ہے کہ جن باتوں کو کوئی قوم مسلّمات یا بدیہیات میں شمار کر لے ان پر غور و فکر کرنے کے لئے ایک عظیم ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ مشکل اور ہوتی ہے اگر کوئی شخص ان امور کے متعلق غور و فکر کی کوشش کرتا ہے تو وہ طبقہ جس کے مفاد اسی میں مضمر ہوتے ہیں کہ قوم ان باتوں کو بطور مسلّمات تسلیم کرتی چلی جائے اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کے لئے جینا محال کر دیتا ہے۔ یہ جو آپ کو تاریخ کے صفحات پر جابجا انسانی خون کے چھینٹے دکھائی دیتے ہیں ان میں اکثر انہی لوگوں کی رگِ جان سے ٹپکے تھے جنہوں نے قوم کے "مسلّمات" پر غور و فکر کی کوشش کی تھی۔

قرآن نے نوعِ انسانی کو ایک ضابطۂ حیات دیا جو زندگی کی تمام خوشگواریوں اور توانائیوں کا ضامن اور انسانیت کے ہر شرف و مجد کا حامل تھا۔ اس کے لئے اس نے کچھ نظریات و معتقدات عطا کئے جو اصل الاصولِ حیات تھے۔ ایک قوم نے ان نظریات و تصورات کو اپنی زندگی کی اساس اور بنیاد قرار دیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان بنیادوں پر ایک ایسی عظیم القدر، ثریا بوس عمارت استوار ہو گئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے نہیں دیکھی تھی۔ اس قوم کے نزدیک ان نظریات کا مفہوم متعین اور ان کا مقصد واضح تھا۔ اس میں انہیں نہ کسی قسم کا ابہام تھا نہ التباس۔ نہ الجھاؤ تھا نہ پیچیدگی۔ نہ اختلاف تھا نہ انتشار۔ جب ان میں سے کوئی لفظ سامنے آتا تو پوری کی پوری قوم کے ذہن میں اس کا ایک ہی مفہوم اور ایک ہی نقشہ ہوتا۔ ان میں سے کوئی شخص چین میں بات کرتا یا مصر میں۔ ان میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ ان نظریات و معتقدات کے متعلق یہی یک جہتی اور ہم آہنگی تھی جس کی بنا پر یہ قوم امتِ واحدہ تھی۔ اس میں نہ مختلف گروہ تھے نہ فرقے۔ نہ الگ الگ مکاتبِ فکر تھے نہ مذاہبِ نظر۔

تاریخ کے چودہ اوراق کو آگے الٹیئے اور دیکھئے کہ آج اس قوم کی کیا حالت ہے ایک فقرہ میں یوں کہیئے کہ اس قوم کا شمار دنیا کی کمزور اور ذلیل ترین قوموں میں ہوتا ہے۔ ان کے ہاں اُن نظریات و معتقدات کے (جو اُن کے لئے اس زمانے میں زندگی اور حرارت کا موجب تھے) الفاظ تو بدستور باقی ہیں لیکن ان الفاظ کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ان کے ذہن میں نہیں مذہبی راہ نماؤں کا ایک کثیر گروہ ہے جو قوم کو اس فریب میں مبتلا رکھے ہوئے ہے کہ ان الفاظ کی حفاظت اور ان بے روح پیکروں

کی پرستش بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ انھوں نے قوم کے دل میں اس خیال کو راسخ کر رکھا ہے کہ ان مسلمات کے متعلق غور و فکر کا خیال تک کرنا بھی کفر و الحاد ہے۔" ایمان کا تقاضا" یہ ہے کہ انھیں بلا سوچے سمجھے مانا جائے اور اس طرف کبھی دھیان بھی نہ جانے پائے کہ ان کے اس طرح ماننے سے حاصل کیا ہوتا ہے اور نہ ماننے سے کیا نقصان؟ ان کے صحیح ہونے کی سند یہ ہے کہ یہ اسلاف سے اسی طرح منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ لہٰذا ان پر غور و فکر کی کوشش اور دعوت اسلاف کی توہین ہے۔ ان حضرات کو یہی تعلیم ان کے مکتبوں اور دارالعلوموں میں ملتی ہے اور اسی تعلیم کو وہ ساری عمر عام کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ ان سے پوچھ بیٹھے کہ ان نظریات و مسلمات کا مفہوم کیا ہے اور ہماری عملی زندگی سے ان کا واسطہ کیا؟ تو بجائے اس کے کہ یہ اس کا اعتراف کریں کہ انھیں اس کا علم نہیں وہ پنجے جھاڑ کر اس "ملحد و بے دین" کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ کہیں استہزاء و استخفاف سے کام لیا جاتا ہے اور کہیں عوام کو یہ کہہ کر بھڑکا دیا جاتا ہے کہ یہ ایک نیا فتنہ پیدا ہوا ہے جس کی اگر بروقت سرکوبی نہ کی گئی تو اس سے دین کا قصر رشید بنیادوں تک سے ہل جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ "دین کے مسلمات" کی اصطلاح ایک ایسی سپر ہے جس کے پیچھے ہر قسم کی جہالت اور حماقت نہایت عمدگی سے چھپ جاتی ہے۔ چھپ ہی نہیں جاتی بلکہ بجائے "علم و فضیلت" بن کر سامنے آتی ہے۔ لیکن اگر ان مزعومہ "مسلمات" کو ذرا کریدا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں اور ان کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ان کے ذہن میں نہیں۔ ہمارے دور میں اس کی بین مثال "منیر عدالت کی رپورٹ" ہے۔ آپ سوچئے کہ اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں" لیکن معلوم ہوا کہ یہ اسی وقت تک مسئلہ تھا جب تک کہ اس کے متعلق کریدا نہیں کی گئی۔ جب منیر عدالت نے اس کے متعلق سوال کیا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ تو اس مسئلہ کی ساری قلعی کھل گئی۔ آپ اس رپورٹ میں دیکھئے۔ بیشتر علمائے کرام نے تو یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ عدالت کو اس سوال سے پہلے نوٹس دینا چاہیئے تھا۔ بعض نے یہ کہا کہ اس سوال کے جواب کے لئے مہینوں کا وقت اور سینکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔ جنھوں نے جواب دیا ان میں سے کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ یہ حالت ہے اس مسئلہ کے متعلق جسے (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) سب سے بنیادی اور اولین مسئلہ کہنا چاہیئے۔ اگر اسی طرح باقی "مسلمات" کے متعلق بھی تحقیق کی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے بھی ہر ایک کا یہی نتیجہ نکلے گا۔ اول تو ان میں سے کسی کا واضح اور متعین مفہوم ان کے ذہن میں نہیں ہوگا۔ اور جو مفہوم ان کی طرف سے بیان کیا جائے گا وہ ایک دوسرے سے نہیں ملے گا۔ مثلاً ان سے پوچھئے کہ اسلام کیا ہے۔ اسلام کی رُو سے زندگی کا مقصد کیا ہے۔ خدا کی بندگی کسے کہتے ہیں۔ خدا اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے۔ نجات کسے کہتے ہیں۔ ثواب سے کیا مراد ہے۔ انبیائے سابقہ اور کتب سابقہ پر ایمان سے کیا مراد ہے۔ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے۔ اللہ کی اطاعت سے کیا مراد ہے۔ رسول کی اطاعت سے کیا مفہوم ہے۔ سنت نبوی کسے کہتے ہیں۔ حدیث اور سنت میں کیا فرق ہے۔ قرآن اور سنت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ خدا کی حاکمیت سے کیا مراد ہے۔ اسلامی شریعت کسے کہتے ہیں۔ ایک اسلامی مملکت میں "اللہ، رسول اور اولوالامر" کی اطاعت کس طرح کی جاتی ہے۔ اختلافی معاملات کے تصفیہ کے لئے آخری اتھارٹی کون سی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ آپ پوچھئے اور

پھر دیکھئے کہ دین کے ان "مسلمات" کے متعلق کس کس قسم کے جواب ملتے ہیں۔

حصول پاکستان سے پہلے ہمارے ہاں (دیگر ممالک کی طرح) اسلام کی حیثیت (دین کی نہیں بلکہ) ایک مذہب کی تھی۔ یعنی خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کی جسے زندگی کے اجتماعی مسائل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ تشکیل پاکستان کے بعد اس کی حیثیت بدل گئی۔ اس لئے کہ اس مملکت نے اس کا فیصلہ کیا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ لہٰذا اب یہاں اسلام کی حیثیت دین (یعنی ضابطۂ حیات) کی ہوگئی جس کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں اور گوشوں سے ہے۔ اس اہم اور بنیادی تبدیلی کا پہلا تقاضا تھا کہ دین کے تمام "مسلمات" کے متعلق طے ہوجاتا کہ ان کا صاف۔ واضح اور متعین مفہوم کیا ہے؟ لیکن اس بنیادی ضرورت کی طرف کسی نے دھیان ہی نہیں دیا۔ ارباب سیاست نے اس طرف اس لئے توجہ نہ دی کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن کے نزدیک اسے کچھ اہمیت ہی حاصل نہ تھی اور جنہیں اس کی اہمیت کا احساس تھا وہ اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتے تھے۔ باقی رہے ارباب شریعت۔ سو (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہ مسائل چھیڑے ہی نہ جائیں۔ انہیں "مسلمات" کہہ کر ٹال دیا جائے۔

طلوع اسلام کو تحریک پاکستان سے دلبستگی اس لئے تھی کہ یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسا خطۂ زمین مل جائے جس میں ہم پھر سے اسی انداز کا معاشرہ قائم کرسکیں جسے قرآنی اصولوں کے مطابق محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کیا تھا۔ چونکہ اسے اس کا احساس تھا کہ اس معاشرہ کی تشکیل کے لئے سب سے پہلی اور بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ ان نظریات و معتقدات کا صاف اور واضح مفہوم متعین ہو جائے جن پر اس معاشرہ کی عمارت کو استوار ہونا ہے اس لئے اس نے ملک کے سامنے اس مطالبہ کو پیش کیا۔ ارباب شریعت نے فوراً بھانپ لیا کہ اس مطالبہ میں ان کے لئے کس قدر خطرات اور ہلاکت کا سامان پوشیدہ ہے۔ وہ اس کا اعتراف تو کر نہیں سکتے تھے کہ ان "مسلمات" کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی متعین مفہوم نہیں اور جو مفہوم ان کے ذہن میں ہے اس پر ان سب کا اتفاق ناممکنات میں سے ہے۔ لہٰذا انھوں نے اسی قدیمی حربہ سے کام لیا اور شور مچا دیا کہ یہ دین کے لئے بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس کی سرکوبی کی جائے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ طلوع اسلام کی مخالفت میں تمام فرقوں کے "علمائے کرام" کیوں متفق ہیں۔ طلوع اسلام کا مطالبہ (جو درحقیقت مملکت پاکستان کا بنیادی مطالبہ ہے) کسی خاص فرقے سے نہیں۔ یہ مطالبہ ان تمام ارباب شریعت سے ہے جن کا دعوےٰ یہ ہے کہ چونکہ مملکت پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے اس لئے اس کی زمام اختیارات علماء کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ لہٰذا یہ تمام حضرات طلوع اسلام کی مخالفت میں متحد ہیں۔

لیکن ان کی اس مخالفت سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوجاتا۔ وہ تو اسی صورت میں حل ہوگا جب "دین کے مسلمات" کا متعین۔ واضح اور متفق علیہ مفہوم سامنے آجائے۔ اور یہ چیز ان حضرات کے بس کی بات نہیں ہے۔ انھوں نے اسلام کے متعلق جو کچھ پڑھا ہے وہ ایک "مذہب" کی حیثیت سے پڑھا ہے۔ دین کی حیثیت سے انہوں نے دیکھا اور سمجھا ہی نہیں۔ یہ ہے اصل مشکل۔ اس مشکل سے

چشم پوشی کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ مملکت میں روز بروز فکر و نظر کا انتشار بڑھتا جا رہا ہے اور سمجھنے سوچنے والا طبقہ اس نتیجہ پر پہنچ رہا ہے کہ اسلام ایک خاص زمانے میں تو مملکت کا راہ نما بن سکتا تھا لیکن اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ آثار بڑے خطرناک ہیں۔ ہمارے ارباب شریعت کے پاس اس خطرہ کا علاج کفر کے فتووں کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جس صاحب فہم و بصیرت طبقہ کے دل میں اسلام کی عظمت کا احساس ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ سوچے کہ اس مشکل کا حل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس مسئلہ کو شروع ہی سے مرکز توجہ بنا لیا جاتا تو یہ مرحلہ آسانی سے طے ہو جاتا۔ لیکن ملک کے نااہل مدبروں کے ہاتھوں ہم جس مقام تک آ پہنچے ہیں وہاں الجھنیں اور پریشانیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ لیکن اس مرحلہ کی دشواری کے یہ معنی نہیں کہ اس سے پھر چشم پوشی کر لی جائے۔ چشم پوشی کرنے سے یہ مشکل حل نہیں ہو سکے گی۔ اس کی پیچیدگیاں اور بڑھ جائیں گی۔ جب ہم نے اس کا فیصلہ کیا ہے کہ ہماری مملکت اسلامی ہو گی تو پھر ان مشکلات کا حل دریافت کرنا لاینفک ہے۔ اس کے لئے سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے "علمائے کرام" سے کہا جائے کہ وہ (ایک مدت معینہ کے اندر) دین کے ان "مسلمات" کا واضح متعین اور متفق علیہ مفہوم پیش کریں۔ اگر انہوں نے ایسا کر دیا تو سبحان اللہ۔ ورنہ ان سے یہ تو کہا جا سکے گا کہ وہ جس معاملہ کے اہل نہیں اس میں دخل انداز کیوں ہوتے ہیں؟ اس سے مملکت کے لئے آگے بڑھنے کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ ورنہ جس طرح ہمارے تمام بنیادی مسائل آج تک بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر گردش کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح آئندہ بھی کرتے جائیں گے حتیٰ کہ مملکت کی توانائیاں ختم ہو جائیں گی۔ اور یہ کتنی بڑی بدبختی ہو گی!

---x---

(۲)

ریفرینڈم

ہمارے ہاں جماعت اسلامی دین کی سب سے بڑی (بلکہ واحد) اجارہ دار بنی ہوئی ہے۔ اس جماعت نے دستور پاکستان کا آگے بڑھ کر استقبال کیا اور اعلان کیا کہ اس سے مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ حالانکہ اس دستور میں (منجملہ دیگر غیر اسلامی امور) یہ شق بھی موجود تھی کہ مرکز اور صوبوں کی مجالس قانون ساز میں غیر مسلم بھی شامل ہوں گے اور انہیں مسلم اراکین جیسے اختیارات حاصل ہوں گے۔ اتنی بڑی غیر اسلامی شق کو اسلامی قرار دے دینے کے بعد، جب انتخابات کا مسئلہ سامنے آیا تو اس جماعت نے اعلان کیا کہ جداگانہ انتخاب نہ صرف پاکستان کی آئیڈیالوجی کا لازمی نتیجہ ہے بلکہ اسلام کا بنیادی تقاضا بھی ہے۔

اب ان حضرات نے یہ مہم شروع کر رکھی ہے کہ ملک سے استصواب (ریفرینڈم) کے ذریعے دریافت کیا جائے کہ یہاں کی اکثریت جداگانہ انتخاب چاہتی ہے یا مخلوط انتخاب۔ آپ ذرا اس مطالبہ کو کرید کر دیکھئے اور پھر سوچئے کہ یہ حضرات قوم اور دین دونوں کے ساتھ کس قسم کے کھیل کھیلتے رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا یہ ہے کہ جداگانہ انتخاب اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ استصواب کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ قوم کی اکثریت مخلوط انتخاب کے حق میں ہے تو اس صورت میں جماعت اسلامی کی

پوزیشن کیا ہوگی؟ اگر یہ اکثریت کے فیصلہ کو تسلیم کرے گی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک غیر اسلامی نظریہ کو قبول کرے گی اور اس پر عمل پیرا ہو جائے گی۔ اور اگر یہ اکثریت کے فیصلے کو تسلیم نہیں کریگی تو پھر استصواب کے مطالبہ کا مطلب کیا ہے؟

جو نظریہ دین کی رُو سے حق ہے وہ حق رہے گا خواہ اس کی تائید میں ایک ہاتھ کبھی نہ اٹھے اور جو باطل ہے وہ باطل رہے گا خواہ اُسے سو فیصد ووٹ حاصل ہو جائیں۔ اگر حق و باطل کے فیصلے ووٹوں کے ذریعے ہونے لگ جائیں تو کائنات میں فساد عظیم برپا ہو جائے۔ اسی لئے قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ (۶/۱۱۷)۔ "اگر تو زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کی بات ماننے لگ جائے تو یہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کردیں"۔[1] آپ نے غور کیا کہ جب کسی جماعت یا اس کے لیڈر کی سیاسی مصلحت کو شایانِ دین کا نقاب اوڑھ لیں تو وہ دین کو کس طرح بازیچۂ اطفال بنا لیتے ہیں؟ مودودی صاحب مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

> "کسی طالب حق کو یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ دنیا کے بیشتر انسان کس راستے پر جا رہے ہیں بلکہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس راہ پر چلنا چاہیئے جو اللہ نے بتائی ہے چاہے اس راستے پر چلنے کے لئے وہ دنیا میں اکیلا ہی رہ جائے"۔ (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ ص ۵۷۶)

ان سے پوچھئے کہ وہ کس راہ پر جا رہے ہیں اور اپنے متبعین کو کس طریق پر چلا رہے ہیں؟

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ تقسیم ہند سے پہلے جماعت اسلامی تحریک پاکستان کی مخالف تھی۔ جب ان سے کوئی کہتا کہ عوام کی اکثریت اس تحریک کی حامی ہے اس لئے آپ اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں تو ان کی طرف سے جواب ملتا کہ

> یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے۔ اس لئے یہ مسلمان ہیں۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ عام انتخابات میں ان کے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہونگے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ (سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم)

لیکن اب انہی مسلمانوں کے ووٹوں سے حق و باطل کا فیصلہ کرایا جا رہا ہے اور (آئندہ الیکشن میں) انہی کے ووٹوں سے (ماشاءاللہ

---

[1] یہ اور بات ہے کہ کوئی بات قرآن کے مطابق حق ہو اور اکثریت اس کی تائید کرے۔ اس صورت میں اس بات کے حق ہونے کی دلیل اکثریت کی تائید نہیں ہوگی بلکہ قرآن کی سند ہوگی۔

وہ "صالحین منتخب ہوں گے جو منہاج نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں گے"۔

آپ نے دیکھا کہ یہ سب حربے وہی ہیں جو سیاسی جماعتیں استعمال کرتی ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی اسے "اقامت دین" قرار دے کر اس کا نام خدمتِ اسلام رکھتی ہے۔ اس "خدمت" کے نام پر سادہ لوح غریب مسلمانوں سے جس انداز سے روپیہ وصول اور جس طریق پر اسے خرچ کیا جاتا ہے اس کی ایک ہلکی سی جھلک المنیر (لائلپور) کی ۱۴ فروری ۵۸ء کی اشاعت میں یوں دکھائی دیتی ہے۔

> "تسنیم" جماعت اسلامی کا آرگن ہے۔ اس وقت تک دو لاکھ سے زائد رقم اس کے خسارے میں ادا کی گئی ہے اور قریب تین ہزار روپیہ ماہوار اس پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ یہ سب اس بیت المال سے خرچ ہوتا ہے جس میں مخلص ترین مسلمانوں کی زکوٰتیں، صدقات واجبہ اور وقتی صدقات شامل ہیں جن کو "اقامت دین" کے نام پر قائم کیا گیا ہے اور جس کے بارے میں جماعت کا حتمی اور ناقابلِ ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کا ہر رکن اپنی پوری زکوٰۃ اس میں لازماً جمع کرائے۔

کوئی پارٹی اپنے ممبروں سے کیا وصول کرتی ہے اور اسے کس طرح خرچ کرتی ہے، اس سے ہمیں کوئی تعلق نہیں۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ جماعت، خالص پولیٹیکل پارٹی ہے لیکن سب کچھ دین کے نام پر کرتی ہے۔ اور یہ ہے وہ فریب جو ملک اور دین دونوں کے لئے سخت خطرناک ہے اور اسی بنا پر طلوع اسلام اس جماعت کی مخالفت کرتا ہے۔

---×---

اس اشاعت میں بھی انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم (بین الاقوامی اسلامی مذاکرات۔ لاہور) کے چند ایک مقالات شائع کئے جا رہے ہیں۔ کچھ مزید مقالات آئندہ شائع کئے جائیں گے۔

---×---

(تیسرا ایڈیشن)　**اسلامی معاشرت**　از:- پرویز

مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآنی ارشادات۔ بالخصوص عورتوں بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں ملے گی۔

قیمت: دو روپے

سلیمؔ کے نام

(عمل بلا معاوضہ)

کل شام احمد بھائی نے ایک دلچسپ بات سنائی۔ ایک روسی وفد ان کی مِل (کپڑے کا کارخانہ) دیکھنے کے لئے گیا۔ اثنائے گفتگو میں وفد کے لیڈر نے پوچھا کہ تمہارے ہاں ایک کاریگر روزانہ کس قدر کام کر کے دیتا ہے۔ یعنی اس کی (OUT-PUT) کیا ہے۔ جواب سننے پر اس نے کہا کہ یہ تو بہت تھوڑا ہے۔ اس پر اسے بتایا گیا کہ ہمارے پیش نظر ایک (INCENTIVE SCHEME) ہے۔ اس کے بروئے کار آنے پر امید ہے کہ کام کی اوسط قریب دس فیصد بڑھ جائے گی۔

تم جانتے ہو کہ (INCENTIVE SCHEME) کے معنی کیا ہیں؟ یوں سمجھو کہ ایک کاریگر چھ گھنٹے روزانہ کام کرتا ہے۔ اسے تین روپے روزانہ مزدوری ملتی ہے اور وہ دو گز کپڑا بن کر دیتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ اگر اتنے ہی وقت میں تم دو کی بجائے سوا دو گز کپڑا تیار کر کے دو، تو تمہیں ساڑھے تین روپیہ یومیہ اجرت دی جائے گی۔ اس سے وہ زیادہ کام کرے گا۔ یعنی آٹھ آنے یومیہ کا اضافہ

جذبۂ محرکہ

اس کے لئے مہمیز کا کام دے گا۔ اسی کو (INCENTIVE) کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، زیادہ کام کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے جذبۂ محرکہ۔

تم کہو گے کہ یہ اسکیم بہت اچھی ہے جب تک اس قسم کا جذبۂ محرکہ نہ ہو کوئی شخص زیادہ کام کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ ـــــ کہ مزدور خوش دل کند کار بیش؛ بہت پرانا مسلّمہ ہے اور ایک مزدور کے لئے اجرت میں اضافے سے بڑھ کر خوش دلی کا سامان اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر ہمارے ہاں کے آجر (ملازم رکھنے والے) کام کرنے والوں کے لئے اس قسم کے (INCENTIVES) مہیا کرتے رہیں تو دیکھئے کام کی رفتار کس تیزی سے بڑھ جاتی ہے۔

ایک تم ہی نہیں، ہمارے ہاں ہر شخص یہی کہے گا، لیکن تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ اس وفد کے لیڈر نے یہ نہیں کہا۔ اس نے اس اسکیم کا ذکر سن کر حیرت سے دیکھا اور بڑے تعجب سے کہا کہ کیا تم لوگ چوری کی حوصلہ افزائی کرتے ہو اور بلیک مارکیٹ کو برا نہیں سمجھتے! یہ طریقہ بڑا غلط ہے۔ قومیں اس طرح ترقی نہیں کر سکتیں۔

تم یقیناً دل میں سوچتے ہو گے کہ اس نے یہ بات کیا کہہ دی۔ مزدوری میں اضافہ کو چوری اور بلیک مارکیٹ سے کیا تعلق؟ اگر قومیں اس طرح ترقی نہیں کیا کرتیں تو اور کس طرح کیا کرتی ہیں؟ بظاہر تمہاری حیرت بجا اور درست ہے۔ مزدور کی اجرت میں اضافہ

ایک عمل مستحسن ہے۔ اسے مذموم قرار دینے کے معنی کیا ہیں؟ لیکن تم اگر ذرا گہرائی میں جا کر دیکھو تو تمہیں صاف نظر آجائے گا کہ اس نے بات بڑی پتے کی کہی ہے۔ یہ واقعی چوری اور بلیک مارکیٹ کی حوصلہ افزائی ہے۔ سنو کہ اس نے کیا کہا ہے۔

بلیک مارکیٹ

ایک مزدور تم سے معاہدہ کرتا ہے کہ وہ چھ گھنٹے روزانہ کام کرے گا اور اس کے بدلے تین روپے اجرت لے گا۔ وہ چھ گھنٹے کام کرتا ہے اور دو گز کپڑا بن کر دیتا ہے۔ لیکن جب تم اسے آٹھ آنے زیادہ دیتے ہو تو وہ انہی چھ گھنٹوں میں سوا دو گز کپڑا بن کر دیدیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اسے تین روپے یومیہ ملتے تھے تو وہ پوری محنت اور توجہ سے کام نہیں کرتا تھا۔ اس میں سے (یعنی اپنی توانائی یا توجہ میں سے) کچھ بچا کر رکھتا تھا۔ اگر وہ اپنی استطاعت اور استعداد کے مطابق پوری پوری محنت کرتا اور ذرا سا وقت بھی ضائع نہ ہونے دیتا تو وہ چھ گھنٹے میں دو گز سے ایک انچ زیادہ کپڑا بھی نہ بن سکتا خواہ اسے دس روپے زیادہ بھی کیوں نہ دیئے جاتے۔ مگر وہ آٹھ آنے زیادہ ملنے پر سوا دو گز کپڑا بن دیتا ہے تو اس کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ سب پہلے وہ اپنی محنت (توانائی، استعداد، توجہ) میں سے کچھ حصہ چھپا کر رکھتا تھا اور اب اسے باہر لایا ہے۔ اسی کا نام چوری اور بلیک مارکیٹ ہے۔ یعنی اس کے پاس زیادہ کام کرنے کی استعداد (CAPACITY) موجود ہے لیکن وہ اسے چھپا کر رکھتا ہے (بلیک میں لے جاتا ہے) اور اس وقت باہر لاتا ہے جب اسے دام زیادہ ملتے ہیں۔ اگر آپ اس کی اس طرح چھپا کر رکھی ہوئی استعداد کو زیادہ داموں پر خریدتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ چوری اور بلیک مارکیٹ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

لیکن یہ چوری دونوں طرف سے ہے۔ کاریگر چھ گھنٹے میں سوا دو گز کپڑا بن کر دے سکتا ہے لیکن وہ دو گز سے زیادہ بن کر نہیں دیتا۔ وہ اپنی محنت کی چوری کرتا اور اسے بلیک میں بیچتا ہے۔ دوسری طرف کارخانہ دار جانتا ہے کہ چھ گھنٹے کی پوری پوری محنت کا معاوضہ ساڑھے تین روپے ہونا چاہیئے لیکن وہ اس کی بجائے تین ہی روپے پر معاہدہ کرتا ہے۔ یعنی وہ اجرت کی چوری کرتا ہے۔ دیانت نہ اُس کے ہاں ہے نہ اِس کے۔

دونوں کے دل میں چور ہے۔ بیٹھے ہیں سامنے
وہ دل لئے ہوئے، میں تمنا لئے ہوئے

اُس وفد کے لیڈر نے اس "چور بازاری" کا علاج کیا بتایا اس کی تفصیل تو معلوم نہ ہو سکی (اس نے تفصیل سے بتایا ہی نہ تھا) لیکن جو کچھ اس نے کہا اس کا ماحصل یہ تھا کہ تم پیداوار (PRODUCTION) کو (دیگر ذرائع سے) اس قدر زیادہ کر دو کہ تمہیں ایک کاریگر سے چھ گھنٹے میں دو گز سے زیادہ کپڑا بنوانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس طرح جب اس کے "بلیک" کے مال کا کوئی پرساں ہی نہیں ہوگا تو اسے بلیک کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

لیکن یہ تو خالص استبداد ہے۔ یعنی طلب (DEMAND) اور رسد (SUPPLY) کا وہی قدیم سرمایہ دارانہ نظریہ جس

قرآنی علاج

کے ماتحت مزدور اپنی محنت کو تمہارے داموں پر بیچنے کے لئے مجبور ہو جائے۔ یہ کوئی علاج نہیں۔ اس کا علاج قرآن بتاتا ہے اور غور سے سنو سلیم! کہ وہ کیا علاج بتاتا ہے۔ وہ کام اور اس کی اجرت کے نظریہ

ہی کو غلط اور باطل قرار دیتا ہے۔ وہ کام کو فریضہ (DUTY) یا ذمہ داری (RESPONSIBILITY) قرار دیتا ہے جس کی اجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کبھی تم نے سنا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فریضہ کو ادا کرے اور اس کے بعد کہے کہ لاؤ میری اُجرت! تم صبح سویرے سیر کے لئے نکلتے ہو اور دو میل کا چکر کاٹ کر آتے ہو۔ کیا تم نے کبھی کسی سے اپنی محنت کی مزدوری مانگی ہے؟ فریضہ یا ذمہ داری کی ادائیگی میں معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایسی عظیم اور بنیادی حقیقت ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ہر پیغمبر اپنی دعوت کی ابتداء اسی اعلان سے کرتا تھا۔ سورہ شعراء کو پڑھو اور دیکھو کہ کس طرح ہر رسول اسی اصول کا اعلان اور اس کا اعادہ کرتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت نوحؑ تشریف لاتے ہیں۔ قوم کو توحید کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ان پر اس حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں کہ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۲۶/۱۰۹) میں تم سے اس کی کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ اس کا تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ میری اجرت اور معاوضہ خدائے رب العالمین پر ہے۔ (اس ٹکڑے کا مفہوم ذرا آگے چل کر سامنے آئے گا) میں یہ سب کچھ اپنا فریضہ اور ذمہ داری سمجھ کر کر رہا ہوں۔ (وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۲۷/۹۱) لہٰذا اس کی اجرت اور معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد حضرت ہودؑ آئے اور انہوں نے بھی اپنی قوم سے یہی کہا کہ (وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۲۶/۱۲۷) میں اس کے بدلے تم سے کوئی اجرت یا معاوضہ کا خواہاں نہیں ہوں۔ پھر قوم ثمود کی طرف حضرت صالحؑ تشریف لائے تو انہوں نے بھی اسی حقیقت کا اعلان فرمایا کہ (مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ..... ۲۶/۱۴۵) یہی حضرت لوطؑ نے کہا۔ (۲۶/۱۶۴) اسی کا اعادہ حضرت شعیبؑ نے فرمایا جب کہا کہ (وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ..... ۲۶/۱۸۰) ان تمام حضرات کے بعد نبی اکرمؐ تشریف فرما ہوئے اور انہوں نے بھی اسی عظیم حقیقت کا اعلان فرمایا کہ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۔ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا (۲۵/۵۷)۔ میں اس کا کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ صرف اتنا ہے کہ تم میں سے جو چاہے اپنے نشوونما دینے والے کی طرف راستہ اختیار کر لے[1]۔ میری دعوت تمام نوع انسان کے لئے ہے اس لئے میں کسی انسان سے بھی اس کا معاوضہ نہیں مانگتا۔ (قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۔ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ۶/۹۰) اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میری اس دعوت کا معاوضہ یہ ہے کہ تم نے اس دعوت کو قبول کر لیا (اور اس طرح گویا میری پارٹی میں شامل ہو گئے) تو تمہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ اس میں بھی میرا کوئی فائدہ مضمر نہیں ہے۔ تمہارا ہی فائدہ ہے۔ (مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۳۴/۴۷) اسی حقیقت کو دوسری جگہ بالکل دگر یوں بیان کیا گیا کہ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ (۵۲/۴۰) کیا تو ان سے کوئی اجر مانگتا ہے جو یہ (اس کے خیال سے) اپنے آپ کو) ایک بیگار (یا جرمانہ) کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا سمجھتے ہیں؟

---

[1] سورۂ شوریٰ میں جو ہے کہ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ ۔ (۴۲/۲۳) تو اس کے بھی یہی معنی ہیں کہ میں تم سے اس کا معاوضہ کچھ نہیں مانگتا۔ صرف چاہتا ہوں کہ تم عزیزداری کے تعلقات کو قائم رکھو۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔

بہرحال قرآن نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر واضح کر دیا ہے کہ حضرات انبیائے کرام کی دعوت کا آغاز (اور انجام) اسی اعلان سے ہوتا تھا کہ ہم اس کا کوئی معاوضہ، کوئی اجرت۔ کوئی بدلہ تم سے نہیں چاہتے۔ یہی وہ بنیادی حقیقت تھی جسے (جامع طور پر) سورۂ یٰسین میں ایک مردِ مومن نے اپنی قوم سے یوں بیان کیا کہ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ۔ اے میری قوم! تم خدا کے رسولوں کی اتباع کرو۔ اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْئَلُکُمْ اَجْرًا وَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ (۳۶/۲۱) یعنی ان کی اتباع کرو جو تم سے کوئی اجر نہیں مانگتے اور خود راہِ راست پر جا رہے ہیں۔

اجر کی مختلف شکلیں

اجر کی بھی کئی شکلیں ہیں۔ ایک شکل تو وہی ہے جسے ہر شخص سمجھتا اور جانتا ہے۔ یعنی مال و دولت کسی کام کے معاوضہ میں روپے کی شکل میں اجرت وصول کرنا۔ قرآن نے اس شکل کی خود ہی وضاحت کر دی ہے جب حضرت نوحؑ کی زبان سے کہلوایا کہ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مَالًا (۱۱/۲۹) میں تم سے اس کے معاوضہ میں روپیہ پیسہ نہیں مانگتا۔ لیکن اس کے علاوہ اجر کی کئی شکلیں ایسی ہیں جو غیر مرئی اور غیر محسوس ہیں اور جنہیں دل کی آنکھیں ہی بھانپ سکتی ہیں ان میں جاہ و منصب اور عزت و تکریم کی خواہش نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ جب فرعون نے اپنے ہاں کے مذہبی پیشواؤں سے کہا کہ وہ (حضرت) موسےٰؑ کا مقابلہ کریں تو انھوں نے اسکے جواب میں کہا کہ اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ کُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِیْنَ (۷/۱۱۳) اگر ہم غالب آ گئے تو ہمیں اس کا معاوضہ تو ملے گا ناں[1]؟ فرعون نے کہا نَعَمْ وَ یقیناً ملے گا۔ وَاِنَّکُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ (۷/۱۱۴)۔ تم ہمارے مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔ سرکار دربار میں تمہاری عزت ہوگی۔ خلعت ملے گی۔ نام پاؤ گے۔ جاہ و منصب حاصل ہوں گے۔

تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے ایک لفظ میں، ان تمام ہوسناکیوں کو کس طرح بے نقاب کر دیا۔ جو بڑے بڑے لوگوں میں "خدمت خلق" یا "خدمت دین" کے لئے جذباتِ محرکہ (INCENTIVES) بنتی ہیں؟ اس سے آگے بڑھو تو اقتدار اور حکومت کا جذبہ (LOVE FOR POWER) ان "خدمات" کا معاوضہ بنتا ہے۔ اس کے لئے قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۳/۷۹) کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے کتاب (قانون) اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہنا شروع کر دے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میری حکومی اختیار کر لو۔ ان مقامات سے واضح ہے کہ جب حضرات انبیائے کرام (اور ان کے متبعین) کہتے ہیں کہ مَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ۔ (میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا) تو اس سے مراد صرف مال و دولت کی شکل میں معاوضہ

---

[1] تم نے غور کیا سلیم! کہ حضرات انبیائے اور ان کے متبعین اور غیر خداوندی مذہب کے پیشواؤں کی ذہنیت میں کس قدر بنیادی فرق ہوتا ہے پیشوایانِ مذہب اور اربابِ شریعت مذہبی مناظروں (یعنی باطل کو شکست دینے) کے لئے بھی اجرت مانگتے ہیں اور قیمت پہلے ٹھیراتے ہیں۔ یہی فرعون کے زمانے میں ہوتا تھا۔ یہی آج ہو رہا ہے!

نہیں ہوتا بلکہ جاہ و منصب۔ شان و شوکت۔ عزت و عقیدت۔ اور اقتدار و حکومت کی تمام شکلیں اس میں آ جاتی ہیں۔ وہ علانیہ کہتے

اللہ کے لئے

ہیں کہ ہم اپنی دعوت اور محنت کا معاوضہ ان میں سے کسی شکل میں بھی لینا نہیں چاہتے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں "للہ" کرتے ہیں۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶/۱۶۲) "ان سے کہدو کہ میری صلوٰۃ اور دیگر تمام مخلص اعمال۔ حتیٰ کہ میرا مرنا اور میرا جینا۔ سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میں ان میں سے سب سے پہلا ہوں جو اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں"۔

تم اس مقام پر پوچھو گے (اور میں نے پہلے ہی اس کی طرف اشارہ کیا ہے) کہ للہ کے معنی کیا ہیں اور اس کا مفہوم کیا ہے کہ میرا اجر اللہ رب العالمین کے ذمے ہے۔ لو۔ غور سے سنو۔

لیکن سنو کیا! یہ چڑیاں کچھ لکھنے تھوڑا دیتی ہیں۔ وہ دیکھو انھوں نے پھر گھونسلہ بنانا شروع کر دیا اور پھر اس میں سے تنکے گر گر

چڑا چڑے کی کہانی

کر میرے میز اور کاغذات پر بکھرنے لگ گئے۔ تم نے پچھلے سال دیکھا تھا کہ ٹھیک میری نشست کے اوپر چڑیوں نے گھونسلہ بنانا شروع کیا تھا۔ ایک چڑا یا اور ایک چڑا صبح سے شام تک دیوانہ وار پھرتے۔ ایک ایک تنکا اکٹھا کرتے۔ اور اپنا گھونسلہ بناتے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ کوئی بیس مرتبہ ان کا گھونسلہ اجڑا ہوگا اور انھوں نے بیس ہی مرتبہ اسے از سر نو بنایا ہوگا۔ انھیں نہ کھانے کی سوجھتی نہ پینے کی۔ نہ چین کا خیال تھا نہ آرام کا۔ دن بھر ان کا یہی کام رہتا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے تنکے اٹھا کر لاتے اور گھونسلہ میں رکھتے۔ یہ سلسلہ غالباً مارچ اپریل تک جاری رہا۔ اس کے بعد سال بھر تک یہ کہیں نظر نہ آئے۔ اب جو پھر وہی دن آئے ہیں تو پھر نمودار ہو گئے ہیں۔ پھر وہی سرگردانی اور دیوانگی۔ وہی خاشاک فراہمی اور آشیاں سازی۔ میں نے ایک دن چڑیا سے پوچھا کہ تم یہ تمام تگ و تاز اور سعی و کاوش کیوں کرتی ہو؟ اس نے کہا کہ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔ مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے اور میں اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہوں۔ میں نے کہا کہ اس سے تمہیں کیا ملتا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے سامنے ملنے ملانے (اجر۔ معاوضہ) کا سوال ہی نہیں (لَا اَسْئَلُ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ) میں یہ سب کچھ (لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ) خدا کی ربوبیت عالمین کے پروگرام کی تکمیل کے لئے کرتی ہوں۔ اور اس کا معاوضہ یہ ہوتا ہے کہ میں انڈے دیتی ہوں۔ انڈوں سے بچے نکلتے ہیں۔ ان بچوں کی اس گھونسلے میں پرورش ہوتی ہے۔ اس طرح خدا کی ربوبیت کے پروگرام کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہی میرا اجر ہے۔ یہی میرا معاوضہ ہے (اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ)

تم نے سمجھ لیا سلیم! کہ "للہ" کے معنی کیا ہیں اور "رب العالمین" کے ذمہ اجر ہونے کا مفہوم کیا؟ کائنات کی ہر شے خدا کے نظام ربوبیت کی تکمیل کے لئے مامور اور سرگرداں ہے۔ وہ اس پر مجبور ہے۔ یہی وہ ان اشیاء کی مجبوری۔ ان کا جذب دروں (INNER URGE) ہے جو انھیں ہزار رکاوٹوں کے باوجود تکمیل فرائض میں چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ انسان کا فریضہ بھی خدا کے نظام ربوبیت کی تکمیل ہے لیکن وہ اس فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے مجبور نہیں پیدا کیا گیا۔ اس سے کہا گیا ہے کہ وہ اس فریضہ کو از خود اختیار کرے۔ اس ذمہ داری کو

بطیبِ خاطر قبول کرے۔ لہٰذا انسان کے ضمن میں "للہ" کے معنی ہیں۔

وہ فریضہ جسے انسان "قوانینِ خداوندی کی رُو سے" بلا خیالِ اجر و معاوضہ "از خود اپنے اوپر عائد کرلے۔

وہ اس طرح خدا کے نظامِ ربوبیت کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے اور اس کا معاوضہ یہ ہوتا ہے کہ اس نظام کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

اور اس نظام کی تکمیل کے معنی یہ ہیں کہ خود اس کی اپنی ربوبیت (اس کے جسم اور ذات کی نشو و نما) ہو جاتی ہے۔

بلیک مارکیٹ نہیں

تم نے غور کیا سلیم! کہ اس جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) کے ماتحت کوئی کام کرنے والا، اپنی سعی و عمل اور تگ و تاز میں اپنی استعداد اور توانائی کی کسی قسم کی چوری نہیں کرتا۔ اگر ایک چڑیا دن میں سو تنکے فراہم کرنے کی استعداد رکھتی ہے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ وہ نوّے تنکے اکٹھے کر کے اطمینان سے بیٹھ جائے۔ اس لئے کہ وہ اس کام کو کسی خارجی معاوضہ کی خاطر ادا نہیں کرتی۔ یہ اس کے جذبۂ دروں (INNER URGE) کا تقاضا ہوتا ہے۔ اور اس کا معاوضہ اس تقاضا کی تسکین۔ جب تک اس کے تقاضے کی تسکین نہیں ہوتی وہ اپنی سرگرمیوں میں فرق نہیں آنے دیتی۔ (جب تک پیاسے کو پانی نہیں مل جاتا وہ اپنی تگ و تاز کو مسلسل جاری رکھتا ہے)۔ اس میں نہ قسم کے تغافل و تکاسل کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ نہ کام چوری اور بددیانتی کا شائبہ۔

اسلامی معاشرہ کی بنیاد

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے "کام اور اجرت" کے نظریہ کے بجائے "فریضہ اور ذمہ داری" کا تصور دے کر انسانی فکر و نظر میں کتنی عظیم تبدیلی پیدا کر دی۔ یہی وہ تصور ہے جس پر وہ اسلامی معاشرہ کی بنیاد رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کے نظامِ ربوبیت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس معاشرہ میں ہر فرد اپنا اپنا کام "فریضۂ زندگی" سمجھ کر کرتا ہے اور اس میں کسی اجر اور معاوضہ کا خیال اس کے دامنگیر نہیں ہوتا۔ وہ افرادِ انسانیہ کی پرورش اور نشو و نما کو اپنی ذمہ داری قرار دیتا ہے اور اس کے بدلے میں اُن سے کچھ نہیں چاہتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ (۷۶/۷) وہ اپنی ذمہ داریوں (اپنے واجبات۔ یعنی جن امور کو انہوں نے اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا ہے انہیں) پورا کرتے ہیں۔ وہ ضرورت مندوں کے رزق کا سامان مہیا کرتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)

ہم جو تمہارے رزق کا سامان کرتے ہیں تو خالص فریضۂ خداوندی سمجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ ہم تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتے۔ معاوضہ تو ایک طرف، ہم تو اتنا بھی نہیں چاہتے کہ تم اس کے لئے ہمارا شکریہ ادا کرو۔

جب ہم نے اپنا فریضہ ادا کیا ہے تو اس میں تمہارے شکر گذار ہونے کی کون سی بات ہے؟

تم نے دیکھا سلیم! قرآن اس باب میں انسان کو کن بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ معاوضہ تو ایک طرف، ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ تم ہمیں (THANK YOU) بھی کہو۔ شکریہ تو اس صورت میں تھا جب ہم نے تمہارے لئے کچھ کیا ہو۔ تمہاری کمی کا پورا کرنا ہمارا فریضہ تھا۔ ہم نے تمہاری کمی پوری کر دی سو اس کا معاوضہ یہ ہے کہ تمہاری کمی پوری ہو گئی اور ہمارا فریضہ ادا ہو گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا

هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ (۵۵/۶۰) کسی کی کمی پورا کرنے کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی کمی پوری ہو گئی۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے، وہ کس قدر غلط ہے۔ قرآن کی رُو سے جو شخص دوسروں کے لئے کچھ کرتا ہے اس کے دل میں احسان کا خیال تک بھی نہیں آنا چاہیئے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲/۲۶۲) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں کھلا رکھتے ہیں اور جو کچھ اس طرح دوسروں کو دیتے ہیں، اس کا احسان رکھ کر انھیں کوفت نہیں پہنچاتے۔ یہ وہ ہیں جن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔ انھیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔

انسان احسان کا بدلہ احسان نہ چاہے۔ لیکن کم از کم اتنا تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ لیکن قرآن "عمل بلا اجر" کے تصور کو اس سے بھی بلند لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى جو کچھ تم دوسروں کو دیتے ہو اسے احسان دہی سے بے نتیجہ اور رائگاں نہ کرو۔ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ..... (۲/۲۶۴) اس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کی خاطر دوسروں کو دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں۔

"اللہ اور آخرت پر ایمان" کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان اپنے اعمال کا بدلہ دوسروں سے نہ طلب کرے۔ حتیٰ کہ اس کا جذبۂ تحرک یہ بھی نہ ہو کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ ریا، اسی کا نام ہے۔ انفاق کا جذبۂ محرک مَرْضَاتِ اللّٰهِ (۲/۲۶۵) "قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی اور صفاتِ الٰہیہ سے یک رنگی" ہونا چاہیئے جس کا فطری نتیجہ انسانی ذات کا استحکام (تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ۔ ۲/۲۶۵) ہوتا ہے۔

غور کرو، سلیم! لوگ کہتے ہیں کہ اگر انفرادی مفاد (PRIVATE ENTERPRISE) اور ذاتی ملکیت (PRIVATE PROPERTY) کو مٹا دیا جائے تو انسان کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرک (INCENTIVE) کوئی نہیں رہتا۔ یہ ٹھیک ہے جب انسان اپنی زندگی اور اس کی تگ و تاز کا مقصد خود ہی متعین کرے تو معاوضے کے علاوہ، کوئی چیز جذبۂ محرک نہیں بن سکتی۔ لیکن جب اس کا مقصدِ حیات، قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی ہو، تو پھر کام (فرائض کی سرانجام دہی) خود جذبۂ محرک بن جاتا ہے۔ اس کام میں وہ اپنی پوری پوری توانائی صرف کر دیتا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی خارجی محرک کی ضرورت ہوتی ہے نہ نگرانِ کار کی حاجت۔ اسی کو قرآن جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (۲۲/۷۸) اور سَعٰى لَهَا سَعْیَهَا (۱۷/۱۹) سے تعبیر کرتا ہے۔ بھرپور کوشش۔ پوری پوری جدوجہد۔ جس میں ذرا سی کوتاہی اور کسلمندی نہ ہو۔ ان کی اس بے لوث سعی و عمل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی بھی ابدی خوشگواریوں کے جھولے جھولتی ہے۔ لیکن وہ زندگی کی ان خوشگواریوں کو بھی بطور معاوضہ طلب نہیں کرتے۔ ان کے عمل کا محرک (INCENTIVE) یہ جذبہ نہیں ہوتا۔ وہ جذبہ صرف (آشیانہ ساز چڑیا کی طرح) قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی ہوتی ہے۔ (یعنی وحی کی رو سے عطا کردہ مستقل اقدار سے موافقت اور مطابقت) یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے کہ

بلند مقصد

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۔ (۹/۷۲)

مومن مردوں اور عورتوں سے اللہ نے اس جنت کا وعدہ کر رکھا ہے جس کی شادابیوں میں کبھی کمی نہیں
آسکتی۔ ان پر آسائش باغات میں وہ خوشگواریوں کی زندگی بسر کریں گے۔

یہ سب کچھ ان کے اعمال کی جزا (اعمال کا حصہ۔ ان کے اندر چھپا ہوا نتیجہ) ہے۔ لیکن وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ (۹/۷۲) قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی۔ صفاتِ الٰہیہ سے مطابقت، اس سے بھی کہیں بڑا صلہ ہے۔ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (۹/۷۲)۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس کا فطری نتیجہ انسانی ذات (PERSONALITY) کا ثبات و استحکام ہوتا ہے اور یہی مقصودِ حیات ہے۔

اس مقام پر شاید تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ "عالمِ روحانیت" میں تو شاید یہ باتیں ممکن ہوں۔ ہم "دنیا داروں" کے ہاں ان کا امکان کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہم "کام" اور اجرت کے تصور کو بالائے طاق رکھ کر زندہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ مزدور

روٹی کا سوال

کے سامنے سب سے پہلا سوال روٹی کا ہے۔ وہ اس سوال کو فراموش کر کے، بلا معاوضہ کام کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ ایسا کرے تو وہ (اور اس) کے بیوی بچے کھائیں کہاں سے؟

تمہارے اعتراضات بالکل بجا اور درست ہیں۔ لیکن قرآن اپنے اس نظام کو "روحانی دنیا" میں نہیں بلکہ خود ہماری "جسمانی دنیا" میں رائج کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ تم دنیا ترک کر کے بن باس اختیار کر لو اور وہاں ترکِ آرزو سے اجرت اور معاوضہ کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ تمہیں اسی دنیا میں رکھتا ہے۔ جہاں ضروریاتِ زندگی کا سوال قدم قدم پر تمہارے سامنے آتا ہے لیکن وہ انتظام ایسا کرتا ہے جس سے انسان کی ضروریاتِ زندگی اس انداز سے پوری ہوتی رہیں کہ کام کی اجرت اور معاوضہ کا خیال ہی اس کے سامنے نہ آنے پائے۔ وہ اسلامی نظام سے کہتا ہے کہ تم ہر کام کرنے والے کو اس کی ضمانت (گارنٹی) دیدو کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی

اس کا حل

اس ضمانت سے، اجرت اور معاوضہ کا سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور اس کے بعد کام کی حیثیت محض فریضہ اور ذمہ داری کی رہ جاتی ہے۔ کام کرنے والے کو معاوضہ کی ضرورت اس وقت تھی جب اس نے اپنی اور اپنی اولاد کی روٹی کی فکر آپ کرنی تھی۔ جب یہ فکر دوسروں نے اپنے سر لے لی تو اس کے ذمے فرائض کی سرانجام دہی رہ گئی۔ اب یہ اس کام کو جو اس کے سپرد کیا جائے گا اپنا فریضہ سمجھ کر پورا کرے گا[1]۔ نہ کسی خارجی جذبۂ محرکہ کی ضرورت ہوگی۔ نہ کسی محاسب و نگران کی حاجت۔

---

[1] ان حقائق کی طرف نومبر ۱۹۵۶ء میں شائع شدہ خط میں بھی توجہ دلائی گئی تھی۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے اس مسئلہ کا حل کیا تجویز کیا ہے جو آج دنیائے معیشت میں اس قدر سردردی کا موجب بن رہا ہے! شاید تم کہہ دو کہ جب لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کام کریں یا نہ کریں، ان کی ضروریاتِ زندگی بہرحال پوری ہوتی رہیں گی تو وہ پوری تندہی سے کبھی کام نہیں کریں گے۔ ان سے مار مار کر کام لیا جائے گا۔ لیکن ایسا سمجھنے اور کہنے میں تم اس چیز کو بھول گئے کہ قرآن ان لوگوں کا ذکر کر رہا ہے جنہوں نے اس طرزِ زندگی کو اپنے ایمان کی بنا پر اختیار کیا ہوگا۔ ان سے مار مار کر کام لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بڑا کون مار مار کر اس پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ دن بھر تنکے کھٹے کرتی رہے! وہ یہ کچھ اپنے جذبِ دروں سے کرتی ہے اور انسان کی صورت میں اسی جذبِ دروں کا نام ایمان ہے۔ ایمان کی کیفیت یہ ہے

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

ہم چونکہ ایمان کی حرارت سے محروم ہیں۔ اس لئے یہ چیز ہمارے ذہن اور خیال میں بھی نہیں آسکتی (اور اگر کوئی کہے بھی تو اس پر یقین نہیں آتا) کہ کوئی شخص معاوضہ اور اجرت کے بغیر بھی کام کر سکتا ہے! موجودہ ماحول میں ہمارا مشاہدہ اور تجربہ یہی ہے کہ جب تک کسی کے سامنے کوئی ذاتی مفاد نہ ہو، وہ کسی کام کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں جن میں ایک شخص (بظاہر) کسی ذاتی مفاد یا غرض کے، کسی "نیک کام" میں مصروفِ عمل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جونہی کوئی حادثہ پیش آئے جس سے اس کے مضمر مفاد کو زد پہنچتی ہو، "بے لوث خدمت" کا شیشہ چور چور ہو جاتا ہے اور حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے ہمارے سیاسی لیڈر ہوں یا مذہبی ریفارمر اور پیشوا۔ ہر ایک یہی دعوے لے کر اٹھتا ہے کہ میں، بغیر کسی ذاتی مفاد کا خیال کئے محض خدمتِ خلق کے لئے میدانِ عمل میں آیا ہوں۔ لیکن (دل میں چھپے ہوئے مقصد میں) ناکامی کی دھیمی سی آنچ اس سارے ملمع کو کھول کر رکھ دیتی ہے۔ ان حالات میں ایسا باور کرنا فی الواقعہ مشکل ہو جاتا ہے کہ ذاتی مفاد کے جذبہ محرکہ کے بغیر بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جادۂ تاریخ پر ان لوگوں کے نقوشِ قدم بھی (ستاروں کی طرح جگمگاتے) دکھائی دیتے ہیں جو اپنی ساری عمر نوعِ انسانی کی بہبود میں صرف کر دیتے ہیں اور قدم قدم پر اس کا ثبوت بہم پہنچائے جاتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کے اولیں داعی (السابقون الاولون) کہلاتے ہیں۔ انہی کی بے مزد اطاعت اس معاشرہ کا بنیادی محور (FIRST CRYSTAL) بنتی ہے جس کے گرد عمل بلا اجرت کے عظیم نتائج کے انبار لگ جاتے ہیں۔ یہی وہ انبار ہیں جن کے بھروسے پر عوام کو اس کی ضمانت دی جاتی ہے کہ ـــــ نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ اس ضمانت سے ان میں عمل بلا اجرت کا جذبہ بیدار ہوتا اور استقامت پکڑتا ہے۔

لیکن یہ کچھ صرف ایمان کے جذبِ دروں سے ہو سکتا ہے۔ اور آج اس جذبِ دروں کا فقدان ہے۔ اقبال کے الفاظ میں

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے　　مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق　　کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

یہ "جذبِ اندروں" ایمان ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن ایمان کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (۷/۵۹) اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور الٰہ نہ ہو۔ تم شاید یہ کہدوگے کہ اس معیار پر تو ہم سب کا ایمان پورا اترتا ہے۔ وہ کونسا مسلمان ہے جو خدا کے سوا اور کسی کی پرستش کرتا ہے؟ ہم میں سے بتوں کو تو کوئی بھی نہیں پوجتا؟ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے توحید (خدائے واحد پر ایمان) کی سطح اس سے کہیں اونچی ہے۔ جیسا کہ تم پہلے دیکھ چکے ہو، خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا ہر عمل "اللہ کے لئے" ہو اور اس کے سوا اس کے سامنے کوئی اور مقصود اور مطلوب نہ ہو۔ اگر اس کے دل میں اپنی خواہشات کا شائبہ بھی آگیا تو وہ توحید پرست نہ رہا۔ یہ "شرک" کی وہ غیر محسوس و غیر مرئی (لیکن سب سے زیادہ خطرناک) شکل ہے جس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر توجہ دلائی ہے کہ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (۲۵/۴۳) کیا تو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات (وجذبات) ہی کو اپنا الٰہ بنالیا؟ یہ ہے وہ الٰہ جس کا پرستار اپنی خدمات کا معاوضہ۔ جاہ و منصب۔ تعریف و ستائش۔ عزت و افتخار۔ لیڈری اور عہدہ داری وغیرہ کی شکلوں میں مانگتا ہے۔ وہ کسی خدمتِ خلق کے کاموں میں اس وقت تک سرگرمِ عمل رہتا ہے جب تک اس کے اپنے الٰہ کی پوجا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن جونہی اس پر زد پڑتی ہے، وہ یوں پلہ جھاڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ گویا اسے اس کام سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ نہیں! بلکہ وہ (اپنی علیحدگی کے فیصلہ کو حق بجانب قرار دینے کے لئے) خود اس کام کی مخالفت پر اتر آتا ہے اور اس کے جواز میں طرح طرح کی دلیلیں تراشتا ہے۔ یہ ہیں وہ "غیر اللہ کے پرستار" جو انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ یہ منافقت کی بدترین شکل ہے۔ (لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں)۔

اب تم پھر وہی پرانا سوال لے کر آجاؤ گے کہ "ایمان کس طرح پیدا ہوتا ہے۔" اور میں پھر وہی جواب دہرادوں گا کہ جس ایمان کے متعلق خود خدا نے کہدیا ہے کہ یہ تمہارے اپنے اختیار کی بات ہے (فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ ۱۸/۲۹) اس ایمان کے متعلق یہ پوچھنا کہ یہ کہاں سے ملے گا اور کیسے پیدا ہوگا، بچپن نہیں تو اور کیا ہے؟ ایمان اپنے چاہنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور

تیرا جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

والسلام

پرویز

مذاکرۂ عالم اسلامی (لاہور)

اسلام میں زرعی زمین کا مسئلہ

(ڈاکٹر سید محمد یوسف - یونیورسٹی آف سیلون - لنکا)

اسلام میں اگرچہ زرعی زمین کا حق ملکیت (غیر متنازعہ فیہ اور) تسلیم شدہ مسئلہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس پر لگان وصول کرنا بھی جائز ہو گیا۔ جس طرح ملکیتِ زر سود لینے کا حق نہیں دلا سکتی اسی طرح ملکیتِ زمین لگان وصول کرنے کا جواز نہیں بن سکتی۔[1] زراعت دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک عطیہ قدرت یعنی زمین کے اصل دستقل ذرائع پیداوار۔ دوسری لاگت اور محنت۔ یعنی بنجر زمین کی آبادکاری کے مصارف اصلی۔ ان میں حفاکشی، کھاد، آلات مستعملہ اور رکھوالی وغیرہ شامل ہیں۔ اگر اسلامی دستور کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسلام نے عطیہ قدرت اور انسانی محنت میں امتیاز کیا ہے۔ اس امتیاز کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اس پیداوار یا دولت میں جو ان کی محنت کا نتیجہ نہیں ہوتی دوسری کے بنیادی حقوق کا بھی خیال رکھیں۔ عطیات قدرت کو ہر شخص آزادانہ طور پر استعمال کر سکتا ہے، لیکن اس میں بھی وہ صرف اتنے حصے کا حقدار ہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو سکے اور جسے وہ دوسروں کی حق تلفی کئے بغیر کام میں لا سکے۔ اس اصول کا مکمل اطلاق پانی۔ نمک۔ جنگلوں۔ چراگاہوں اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں پر ہوتا ہے۔[2] اگر کوئی شخص معاشرے کے دوسرے افراد کے مقابلے میں غیر قانونی طور پر یا بہ زور مناسب حدود سے تجاوز کرتا ہے تو اس کا یہ عمل بیمہ (اجارہ داری) کہا جائے گا اور بیمہ یا اجارہ داری اس وقت ہوتی ہے جب ایک شخص کاروباری مصلحت کے تحت اجتماعی تجارت پر قابض ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ چیز غیر سماجی اور ناجائز سمجھی جاتی ہے کیونکہ یہ اس اصول کی نفی کرتی ہے جس کی رو سے بنجر زمین کا مالک صرف وہی شخص بن سکتا ہے جو اسے آباد کرنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے۔ زمین کو آباد کرنے والا خواہ معاشرے کا ایک فرد ہو یا خود حکومت۔ اس کی قیمت کا تعین۔ لاگت اور محنت یعنی مصارف

---

[1] جس چیز کا صرف حق انتفاع (فائدہ اٹھانے کا حق) ہو اُسے ملکیت کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ ملکیت میں حق انتفاع سے آگے اور حقوق بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ زمین پر حق ملکیت کا تصور غیر قرآنی ہے۔　(طلوعِ اسلام)

[2] خود زمین پر ہوتا ہے۔　(طلوعِ اسلام)

آبادکاری سے ہی ہوگا۔ قیمت مقرر ہونے کے بعد خرید و فروخت کا سلسلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب آدمی اتنی زمین کا مالک بن جاتا ہے جس کی وہ خود کاشت نہیں کر سکتا۔ پھر اس طرح اپنی ضرورت اور حیثیت سے زیادہ زمین رکھنے والے کی حالت اس سرمایہ دار کی سی ہو جاتی ہے جو مزدور کی شرکت صرف اس لئے قبول کرتا ہے کہ اس کی محنت کی بدولت استحصال زر کرے۔

یہ بات ناممکن ہے کہ تجارت کے میدان میں تو اسلام محنت و سرمائے کی شرکت پر سخت بندشیں عائد کرے اور زراعت میں ایسا کرنا بھول جائے۔ مدینے کے انصار زراعت پیشہ تھے اور مکے والے تجارت کرتے تھے۔ اور استحصالِ زر کا عمل دونوں پیشوں میں جاری و ساری تھا۔ لہٰذا بندشوں کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ "مخاطرہ" (یعنی ایسا نفع جو محض اتفاق کا نتیجہ ہو) کو ناجائز قرار دے کر جس طرح تجارت کو محفوظ رکھا گیا اسی طرح زراعت کو بھی اس کا شکار ہونے سے بچایا گیا۔

ایام جاہلیت میں یہ عام دستور تھا کہ زمین اس شرط پر کاشت کے لئے دی جاتی تھی کہ مالک کو زمین کے ایک مخصوص ٹکڑے (جو لازمی طور پر سب سے زیادہ زرخیز ہو) کی پیداوار دی جائے۔ اسلام نے اس رواج کو ختم کر دیا۔ جس طرح تجارت میں سود لیا جاتا ہے اسی طرح ایک اور رواج کے مطابق زمین مقررہ مقدار جنس ادا کرنے پر دی جاتی تھی۔ اسلام نے اسے بھی ناجائز قرار دیا۔ اب صرف ایک تیسری صورت باقی رہ گئی۔ یعنی یہ کہ زمین بٹائی پر دی جائے۔ رسول اللہ صلعم کی توجہ جب اس امر کی طرف مبذول کرائی گئی (جس کا واضح ثبوت موجود ہے) تو آپ نے صرف اتنا فرمایا من کانت لہ ارض فلیزرعھا او لیمنحھا۔ فان لم یفعل فلیمسک ارضہ۔

یہ حقیقت ہے کہ "المزارعہ" یعنی بٹائی کا دستور صحابہ میں عام طور سے رائج تھا۔ لیکن اس بات کا بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ قوی ثبوت موجود ہے کہ آپؐ کی رحلت کے بہت عرصے کے بعد اس کی صحت کے بارے میں عظیم شبہات کا اظہار کیا گیا۔

الحسن البصریؒ کی یہ تجویز (جو شاید حضرت عمر فاروقؓ کے دستور سے ماخوذ ہے) کچھ کم معنی خیز نہیں کہ مالک کو بھی محنت اور لاگت میں دوسرے حصہ دار کا شریک ہونا چاہیئے تاکہ دولت میں اس کا حصہ عطیۂ قدرت کی قیمت کے زمرے میں نہ آجائے۔ بڑے فقہا میں امام ابوحنیفہؒ نے المزارعہ کو ناجائز قرار دیا۔ امام الشافعیؒ نے انگور اور کھجور کا معاوضہ اس لئے جائز قرار دیا کہ ان کے نزدیک ان کا شمار المساقات میں ہوتا ہے۔ لیکن پیغمبر اسلام نے یہودیوں سے جو فیصلہ کیا یا مہاجرین و انصار میں جو دستور رائج کیا اور جسے سند کے طور پیش کیا گیا، اسے کسی طرح بھی المساقات نہیں کہہ سکتے۔ دراصل بعد کے فقہائے جو رائج الوقت دستور التعامل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے المزارعہ اور المضاربہ میں مناسبت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ انھوں نے اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیا کہ المزارعہ میں عطیۂ قدرت کے ذرائع پیداوار شامل ہیں اور المضاربہ میں نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ جگہ جگہ اس حقیقت سے واقف ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ لاگت اور محنت کا معاوضہ جائز ہے لیکن استحصالِ زر کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب ایک شخص دوسرے سے عطیۂ قدرت کی قیمت وصول کرنا اپنا جائز حق سمجھنے لگتا ہے[1]۔ رچرڈ نے لگان کی تعریف یوں کی ہے کہ یہ وہ

---

[1] اسی لئے تو قرآن عطیۂ قدرت پر کسی کی ملکیت جائز نہیں قرار دیتا۔ (طلوع اسلام)

آمدنی یا قیمت ہے جو بغیر محنت کے غیر اخلاقی و غیر معاشری ذرائع استعمال کرکے وصول کی جاتی ہے۔ پرانے فقہاء ہوں یا آج کل کے ماہرین اقتصادیات سب اس بات پر متفق ہیں کہ زرعی پیداوار میں لاگت اور محنت کو عطیۂ قدرت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بٹائی کا رواج طریقۂ اسلام کے منافی ہے اور بڑے فقہا بٹائی کو صرف التعامل یا دفع الحاجہ کی بنیاد پر جائز قرار دیتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے تو پھر زمین کو مقررہ قیمت پر یا پٹے پر دیئے جانے کے متعلق کیا تاویل پیش کی جا سکتی ہے؟ یہ دستور بھی پیغمبر اسلام کے زمانے میں عام طور سے رائج نہیں تھا۔ مگر پھر بٹائی کا رواج اسلام میں آ کہاں سے گیا؟ بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ سخت تعجب ہے کہ ان شکوک و شبہات کی بنا پر جو زمین کی انفرادی ملکیت کے سلسلہ میں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوئے ان سے یہ ایک فرار کی راہ نکالی گئی اور اس نے پھر اتنی اہمیت حاصل کر لی کہ اجتماع کے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے حضرت ابن عباسؓ جیسے فقہا نے زمیندار اور مزارع کے درمیان تعلق کو اجارہ کا رنگ دے کر زمین کو پٹے پر دیا جانا جائز قرار دے دیا۔ لیکن اسے خواہ کوئی صورت یا نام دیں یہ الجھن بہرحال باقی رہ جاتی ہے کہ ان دونوں میں کس قسم کا اشتراک جائز مانا جائے۔؟ کیا پیغمبر اسلام نے اسے جائز قرار دیا تھا؟ نہیں۔ کیا انھوں نے کبھی المزارعہ یا الاجارہ کے آئندہ جائز ہو جانے کے امکان کا ذکر کیا تھا؟ قطعی نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس جب کبھی المزارعہ یا الاجارہ کا ذکر کیا تو یہی کہا کہ زمیندار یا تو خود زمین کی کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دیدے۔ (اور پھر آپ نے طنز کے طور پر فرمایا کہ) اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو بڑی خوشی سے اس کے ساتھ چمٹا رہے اور نہ خود فائدہ اٹھائے اور نہ دوسروں کو مستفید ہونے دے۔ اب زمیندار کے لئے متبادل صورت صرف یہی رہ گئی تھی کہ وہ بٹائی کی صورت میں مزارع کے ثمرۂ محنت کا حصہ دار بنے یا پھر پٹے کا دستور اپنائے۔

لوگ عموماً اتنے فیاض نہیں ہوتے کہ اپنی زمین بغیر معاوضے کے دوسروں کو کاشت کے لئے دیدیں اس لئے زائد زمین کے بارے میں پیغمبر اسلام کا ارشاد انھیں تکلیف دہ اور جبری محسوس ہوا۔ جس کی وجہ سے زمین کو آباد کرنے میں مشکلات پیش آئیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ مندرجہ بالا حدیث مستند مانی جاتی ہے اور اس پر کسی قسم کے شک و شبہ کا اظہار نہیں کیا جاتا بلکہ اکثر اسی حدیث کو حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی ادلیت کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود طاؤس بن کیسان جیسے زمیندار دل نے اپنے آپ کو حق بجانب قرار دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم مزارعین سے فیاضی برتتے ہیں اور ہمارا مقصد ان کی امداد کرنا ہے نہ کہ انھیں لوٹنا۔ لیکن ان کے برعکس حضرت ابن عمرؓ اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے۔ جب تک وہ لگان معاف نہیں کر دیتے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق نے مفتوحہ زمین کے بندوبست کا جو دستور رائج کیا، پروفیسر داہاؤزن کے الفاظ میں اس کا بنیادی مقصد عربوں کی مالک بننے کی جبلت کو زمین کی خرید سے باز رکھنا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کے جانشین خلیفہ نے جب یہ قانون ختم کر دیا تو یہ عمل سلطنت کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کا وسیلہ بنا۔

سلہ کلوکیم کی طرف سے شائع کردہ (اردو اور عربی) مقالات میں یہ حصہ عبارت مبہم ہے اسے ہم نے اپنی طرف سے صاف کرکے لکھا ہے۔ (طلوع اسلام)

ابتدائے اسلام کے دستور العمل کو اب بھی ہم انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھنے کے باوجود اس بات کی اشد ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ زمیندار اور مزارع کے اشتراک کے بارے میں جو مستقل شکوک اب تک قائم ہیں۔ ان کی پیغمبر اسلام کے واضح احکام کی روشنی میں نئے سرے سے چھان بین کی جائے۔ ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ابتدا میں زمین کی آبادکاری پر جو بندشیں عاید کی گئی تھیں اور جو دستور رائج کیا گیا تھا وہ ایسا ہی تکلیف دہ محسوس ہوا ہوگا جیسا کہ آجکل ہم میں سے اکثر سود کے مکمل حرام ہونے کے متعلق محسوس کرتے ہیں لیکن اب جبکہ جاگیردارانہ نظام جو شاید ماضی میں کبھی انسانی ترقی کے لئے ضروری تھا ختم ہو چکا ہے کیا ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم پیغمبر اسلام کی فہم و فراست سے فائدہ اٹھائیں اور ان کے واضح اور صریح احکام کو بغیر کسی تکلف کے سختی سے رائج کرنے کی کوشش کریں۔

اس بحث کے دوران میں جو حدیثیں آئی ہیں ان کی تصریح۔

(۱) حسن بصری نے کہا ہے کہ " اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ زمین ایک آدمی کی ہو اور دوسرا آدمی اس میں کھیتی کرے بشرطیکہ اس میں خرچ دونوں کا ہو اور آمدنی بھی دونوں کی ہو۔ زہری کی رائے بھی یہی ہے

(۲) ہم نے رافع سے سوال کیا کہ دینار و درہم کے ساتھ زمین کو کرایہ پر دینا کیسا ہے ؟ تو رافع نے کہا کہ دینار و درہم کے ساتھ کرایہ پر دینے میں مضائقہ نہیں۔ مگر دوسری روایات میں ان الفاظ کی زیادتی موجود ہے کہ ــــ رہ گیا سونا چاندی تو ان کے ساتھ ان دنوں زمین کو کرایہ پر دینے کا رواج نہیں تھا۔

(۳) ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بہترین طریقہ جو تم اختیار کر سکتے ہو یہ ہے کہ ایک سال سے دوسرے سال تک کے لئے صاف زمین کو کرایہ پر لے لو۔ عمروؓ کہتے ہیں کہ میں نے طاؤس سے عرض کیا کہ کاش آپ اس مخابرہ کو چھوڑ دیتے کیونکہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے اس سے منع فرما دیا تھا۔ اس پر طاؤس نے فرمایا کہ اے عمرو! میں تو ان کو زمین دیتا اور ان کی مدد کرتا ہوں (انہیں مالدار بناتا ہوں) اور ان لوگوں میں سے سب سے زیادہ جاننے والے شخص یعنی ابن عباسؓ نے مجھے بتایا ہے کہ نبی اکرم صلعم نے اس سے ممانعت نہیں فرمائی تھی بلکہ یوں فرمایا تھا کہ تم میں سے کسی کا اپنے بھائی کو بطور عطیہ کے زمین دیدینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ اس پر معین کرایہ وصول کیا جائے۔

خط و کتابت کرتے وقت

خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف

ناظم ادارہ

مجلسِ اقبال

مثنوی رموزِ بیخودی

در معنیٰ ایں کہ چوں ملّت محمدیہ مؤسس بر توحید و رسالت است،
پس نہایت مکانی ندارد

گذشتہ چند ابواب سے 'رسالتِ محمدیہ اور امتِ مسلمہ کے مختلف گوشوں کے متعلق گفتگو ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اس ضمن میں زیرِ نظر عنوان میں' اس حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے کہ

(۱) چونکہ امتِ محمدیہ کی تشکیل' وطن۔ نسل۔ زبان وغیرہ کی بنیادوں پر نہیں ہوئی۔ بلکہ دین (توحید و رسالت) کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ اور

(۲) دین (توحید و رسالت) عالمگیر حقائق ہیں جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں ہیں۔ کسی خاص خطۂ زمین یا کسی خاص قوم تک محدود نہیں۔ اس لئے امتِ محمدیہ کسی ایک مقام میں محدود نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک عالمگیر امت ہے جو تمام نوعِ انسانی کو محیط ہے۔

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہماری ملت کا اصل (جوہر (دین) کسی خاص مقام سے وابستہ نہیں۔ یہ وہ بادۂ تند و تیز ہے جو کسی خاص پیالے میں محدود نہیں۔

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گلِ اندامِ ماست

اس کا پیکر بیشک ہندی و چینی۔ رومی و شامی۔ یعنی مختلف نسلوں اور مختلف ملکوں کے بسنے والوں سے ترتیب پاتا ہے۔ لیکن

قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بومِ او بجز اسلام نیست

جہاں تک قلب ملت کا تعلق ہے (جس سے اس کی موت و حیات وابستہ ہے) وہ نہ ہندی ہے نہ چینی۔ نہ رومی ہے نہ شامی۔ اس کی ساری نسبتیں اسلام سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

پیش پیغمبرؐ چو کعبؓ پاک زاد — ہدیۂ آورد از بانت سعاد
در ثنایش گوہر شب تاب سفت — سیفِ مسلول از سیوف الہند گفت

حضرت کعبؓ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مشہور قصیدۂ نعتیہ (بانت سعاد) پیش کیا۔ اس قصیدہ میں انھوں نے حضورؐ کو "سیف من سیوف الہند" کے الفاظ سے تعبیر کیا تھا۔ (یعنی ہندوستان کی تلواروں میں سے ایک تلوار)۔ اس زمانے میں ہندوستان کی تلواریں بہت مشہور تھیں۔

آں مقامش برتر از چرخِ بلند — نامدش نسبت بہ اقلیمے پسند
گفت سیفٌ من سیوف اللہ گو — حق پرستی! از براہِ حق مپو

یہ تشبیہ جس میں ایک ملک کی طرف نسبت تھی حضورؐ کو پسند نہ آئی۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ "سیف من سیوف الہند" کی بجائے "سیف من سیوف اللہ" کہنا چاہیئے (یعنی اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) حق پرستوں کو حق کے راستے سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹنا چاہیئے۔

ہمچناں آں رازدانِ جزر و کل
گردِ پایش سرمۂ چشمِ رسل

اسی طرح حضورؐ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا (یہ چیز اگلے شعر میں آتی ہے) لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس شعر میں حضرت علامہ حضورؐ کی تعریف و توصیف میں قرآنی حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ یوں تو ایک جہت سے "رازدانِ جزر و کل" کے ٹکڑے کو بھی محلِ نظر قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن گردِ پایش سرمۂ چشمِ رسل تو قرآن کی تعلیم کے صریحاً خلاف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کی رو سے حضرات انبیائے کرام کے مدارج میں فرق ہے۔ (تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض) لیکن کسی نبی کی گردِ پا کو باقی انبیاء کی آنکھوں کا سرمہ قرار دینا بڑی زیادتی ہے۔ یقین ہے کہ خود نبی اکرمؐ بھی اپنے متعلق ایسا سننا پسند نہ فرماتے حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ جب اس میں انسان جذبات کی رو میں بہتا ہے تو حدود کا پاس نہیں رہتا۔

بہرحال حضورؐ نے فرمایا۔

گفت با امت "ز دنیائے شما
دوست دارم طاعت و طیب و نساء"

کہ تمہاری دنیا سے مجھے اطاعت، خوشبو اور عورتیں پسند ہیں۔

گر ترا ذوقِ معانی راہ نما ست — نکتۂ پوشیدہ در حرفِ شما ست

یعنی آں شمع شبستانِ وجود بود در دنیا و از دنیا نبود

"دنیائے شما" کے الفاظ سے علامہ اقبال نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ حضورؐ کا مطلب یہ تھا کہ یہ دنیا تمہاری ہے۔ میری دنیا یہ نہیں۔ اگرچہ میں اسی دنیا میں رہتا ہوں لیکن یہ میری دنیا نہیں۔ میری دنیا اور ہے۔

ہمارے نزدیک "شما" (کسو) کے لفظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا نکتہ آفرینی ہے۔ اور اس نکتہ آفرینی سے ذہن جس طرف منتقل ہوتا ہے وہ قرآن کے طالب علم کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے۔ اس سے یہ تصور سامنے آجاتا ہے کہ یہ دنیا عام انسانوں کی ہے۔ خدا کے برگزیدہ بندے اس کی طرف اپنی نسبت تک بھی کرنا پسند نہیں کرتے۔ یہ وہی رہبانیت کا تصور ہے جس کی رو سے اس دنیا کو قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ تصور قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ خدا کی طرف سے وحی ملنے کی خصوصیت کو اگر الگ کر لیا جائے تو ایک نبی کی دنیا اور اس کے متبعین کی دنیا ایک ہی ہوتی ہے۔ اُس کے اور اس کے متبعین کے عقائد۔ تصورات۔ نظریات سب ایک ہوتے ہیں۔ وہ خود سب سے پہلے اپنی وحی پر ایمان لاکر "انا اول المسلمین" کہتا ہے اور اس کے بعد اس کے متبعین بعینہٖ اسی طرح اس وحی پر ایمان لاتے ہیں۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ..... (۲/۲۸۵) قرآن کا واضح اعلان ہے۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ نبی کی دنیا اور ہوتی ہے اور اس کے متبعین کی دنیا اور۔ ان دونوں کی دنیا ایک ہی ہوتی ہے۔ وہ (متبعین) نبی کی قیادت میں اس دنیا میں آسمانی انقلاب پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور اس پر خدا کا تختِ اجلال بچھاتے ہیں۔ یعنی یہاں ایسا نظام تشکیل کرتے ہیں جو قوانین خداوندی کی بنیادوں پر استوار ہو۔ اسی لئے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً ان سب کی مشترکہ دعائیں ہوتی ہیں۔

قطع نظر ان امور کے، ہمیں یہ حدیث ہی بڑی کمزور نظر آتی ہے۔ باور نہیں کیا جا سکتا کہ حضورؐ کا ارشاد ہو کہ "مجھے اطاعت۔ خوشبو۔ اور عورتیں پسند ہیں"۔

اسی نکتہ کی مزید وضاحت میں کہا گیا ہے

جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز — بود اندر آب و گل آدم ہنوز
من ندانم مرز و بوم او کجاست — ایں قدر دانم کہ با ما آشناست
ایں عناصر را جہانِ ما مشو — خویشتن را میہمانِ ما مشو

پہلے شعر میں اُس حدیث کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ کنت نبیا و آدم بین الماء والطین۔ میں اُس وقت نبی تھا جب آدم ہنوز پانی اور مٹی کی حالت میں تھا۔ یہ حدیث بھی صحیح نہیں سمجھی جا سکتی۔ یہ متصوفانہ ذہنیت کی غماز ہے اور قرآنی تصور کے خلاف۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، وحی کی دنیا (یعنی جس مقام سے نبی کو وحی عطا ہوتی ہے) یقیناً ایسی ہے جس میں کوئی غیر نبی شریک

نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے نبی کا تعلق ایک اور دنیا سے ہوتا ہے لیکن وحی کی تعلیم کی رُو سے، یہ دنیائے عناصر، نبی اور اس کے متبعین کی مشترکہ دنیا ہوتی ہے۔ اس میں نبی کی حیثیت مہمان کی اور اس کے متبعین کی حیثیت میزبان کی نہیں ہوتی۔ اگر مطلب یہ ہے کہ نبی اسی دنیا میں پھنس کر نہیں رہ جاتا تو یہی مسلک اس کے حقیقی متبعین کا بھی ہوتا ہے۔ نبیؐ کی حیاتِ طیبہ اس کے متبعین کے لئے اسوۂ حسنہ ہوتی ہے۔ اگر نبی کی دنیا کوئی اور ہو تو اس کی زندگی اُس کے متبعین کے لئے چراغِ راہ کیسے بن سکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال جس اصول کی وضاحت چاہتے تھے (کہ امتِ محمدیہؐ کسی مقام سے وابستہ نہیں ہوتی اور اسلام میں قومیت کا مدار اشتراکِ وطن نہیں) اس کے لئے انھوں نے جس نکتہ کا انتخاب کیا ہے وہ کچھ ایسا برمحل نہیں! اس سے اُس اصول کی نمایاں اور واضح طور پر تائید نہیں ہوتی۔ یہ عنوان (کہ اسلام میں قومیت کا معیار وطن نہیں۔ دین ہے) اقبال کے کلام میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اسے انھوں نے بے شمار مقامات پر پیش کیا اور دہرایا ہے۔ انھوں نے اسکی تائید میں اُن مقامات پر جو دلائل پیش کئے ہیں وہ زیرِ نظر نکتہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ واضح اور محکم ہیں۔ ایسے واضح کہ ان سے بغیر کسی دور از کار تاویل سے بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اس کے بعد وہ مسلمانوں کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

زانکہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم
خویش را در خاکداں گم کردہ ایم

ہم نے چونکہ ایمان کو اپنے ہاں سے رخصت کر دیا (جو ہمارے سینہ میں بمنزلہ جان کے تھا) اور جان کے چلے جانے سے انسان صرف پیکرِ آب و گل رہ جاتا ہے۔ اس لئے ہم وطن کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئے۔

مسلم استی دل باقلیمے مبند
گم شو اندر جہانِ چون و چند

تم مسلمان ہو۔ مسلمان کا شعار یہ نہیں کہ وہ وطن کی حدود میں محصور ہو جائے۔ تمہیں اس مجسمِ آب و گل اور جہانِ سنگ و خشت میں گم نہیں ہو جانا چاہیئے۔

می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم
در دلِ او یا دہ گردد شام و روم

مسلمان کبھی ملک اور وطن کی گلیم میں نہیں سماتا۔ ملک و وطن خود اس کے دل کی اقلیم میں گم ہو جاتے ہیں۔

دل بدست آور کہ در پہنائے دل
می شود گم ایں سرائے آب و گل

تمہیں اپنے پیکرِ آب و گل سے آگے بڑھ کر دل پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ اس لئے کہ دل کی دنیا اس قدر حدود فراموش ہے کہ اس میں یہ ساری دنیائے محسوسات گم ہو جاتی ہے۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

نبی اکرمؐ نے اپنے وطن مکہ سے ہجرت فرما کر، مسلمانوں کی قومیت کا راز بے نقاب کر دیا۔ یعنی آپؐ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ معرکۂ دین و وطن میں، وطن کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جو فضا، نظامِ خداوندی کی تشکیل و قیام کے لئے سازگار ہو، وہی مسلمان کا وطن ہے۔

حکمتش یک ملّتِ گیتی نورد
بر اساسِ کلمہ تعمیر کرد

حضورؐ کی حکمتِ بالغہ نے آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر ایک عالمگیر برادری کی تشکیل فرمائی جس سے ساری دنیا ان کا وطن ہو گیا۔

تا ز بخششہائے آں سلطانِ دیں
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں

اسی نظریۂ حدود فراموش کا نتیجہ ہے کہ مسلمان کے لئے ساری زمین مسجد قرار پا گئی۔ یعنی جس مقام کی فضا بھی سازگار ہو، وہاں نظام خداوندی کی ابتدا کر دی جائے۔

آں کہ در قرآں خدا او را ستود — آں کہ حفظِ جانِ او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش — لرزہ بر تن از شکوہِ فطرتش

دونوں شعر نبی اکرمؐ کی تعریف و ستائش میں ہیں۔ "آں کہ حفظِ جانِ او موعود بود" سے غالباً قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ واللہ یعصمک من الناس (۶۷/۵) لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس آیت میں حضورؐ کی جسمانی حفاظت کا وعدہ نہیں۔ اس لئے کہ دوسری جگہ قرآن میں (نبی اکرمؐ کے متعلق) ہے کہ اَفَاِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ ...... (۱۴۴/۳) اگر وہ مر جائے یا قتل کر دیا جائے ...... اس میں حضورؐ کے قتل ہو جانے کا امکان موجود ہے۔ نیز تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کو جنگ احد میں زخم بھی لگے تھے ان حقائق کے پیشِ نظر، سورۂ مائدہ کی مندرجہ بالا آیت سے حفاظتِ رسالت مقصود نظر آتی ہے۔

بہر حال، نبی اکرمؐ کے متعلق مندرجہ صدر دو اشعارِ مدحیہ کے بعد کہا ہے

پس چرا از مسکنِ آبا گریخت — تو گماں داری کہ از اعدا گریخت؟
قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند — معنیٔ ہجرت غلط فہمیدہ اند

اگر مسلمان کے نزدیک وطن کی کوئی مستقل قدر ہوتی تو حضورؐ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر مدینہ کیوں تشریف لے جاتے؟ قصہ گو اور داستاں سرا واعظ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ حضورؐ دشمنوں کے ڈر سے جان بچا کر عازمِ مدینہ ہوئے تھے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ ہجرت فرار کا نام نہیں۔

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است — ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنیٔ او از تنک آبی رم است — ترکِ شبنم بہرِ تسخیرِ یم است

ہجرت تو مسلمان کی زندگی کا آئین ہے۔ اس لئے اس کے دین اور حیاتِ ملی میں استحکام و ثبات پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ جس مقام پر پانی کی کمی ہو جانور وہاں سے انتقالِ مکانی کر کے اس جگہ چلے جاتے ہیں جہاں سامانِ حیات کی فراوانی ہو۔ مسلمان کی زندگی صرف جسم کی زندگی نہیں۔ اس کی زندگی کا راز اس کے دین کی تقویت میں ہے۔ وہ اگر ایک جگہ دیکھتا ہے کہ اس کے دین کے استحکام کے لئے میدان تنگ ہے تو وہ وہاں سے ایسی جگہ چلا جاتا ہے۔ جہاں فضا میں وسعت اور کشادہ ہو۔ ہجرت درحقیقت سمندر کو مسخر کرنے کے لئے شبنم کو چھوڑ کر چلے جانا ہے۔

بگذر از گل۔ گلستاں مقصود تست
ایں زیاں پیرایہ بندِ سود تست

تم پھول کو چھوڑ دو۔ اس لئے کہ تمہارا مقصود گلستاں ہے۔ ایک پھول نہیں۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ پھول کے چھوڑ دینے میں نقصان ہے۔ لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ پھول کے چھوڑ دینے سے پورا گلستاں ہاتھ آجاتا ہے تو پھول کا چھوڑ دینا نقصان کا باعث نہیں بلکہ نفع کا موجب بن جاتا ہے۔

مہر را آزادہ رفتن آبروست
عرصۂ آفاق زیر پائے اوست

سورج کی عظمت اسی وجہ سے ہے کہ وہ کسی خاص مقام کا پابند نہیں بلکہ وسیع و عریض فضا میں آزادانہ سفر کرتا ہے اور پوری کائنات (فضا) اس کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے۔

ہمچو جو سرمایہ از باراں مخواہ
بیکراں شو در جہاں پایاں مخواہ

تم دنیا میں ندی اور نالوں کی طرح نہ رہو کہ بارش ہوگئی تو ان میں روانی آگئی۔ اور اگر بارش نہ ہوئی تو ان کی ہستی ختم ہوگئی۔ تمہیں ایک بحرِ بیکراں کی طرح زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ جس کا کوئی کنارہ اور حد نہیں ہوتی۔

بود بحرِ تلخ رو یک سادہ دشت
ساحلے درزید از شرم آب شد

سمندر درحقیقت ایک وسیع و عریض میدان تھا جس کا کوئی کنارہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے لئے ساحل کا انتخاب کر لیا تو مقید ہوگیا۔ اس محدودیت سے وہ ملے شرم کے پانی پانی ہوگیا۔

بایدت آہنگِ تسخیرِ ہمہ
تا تو می باشی فراگیرِ ہمہ

تمہارا مقصد، ارادہ اللہ پروگرام یہ ہونا چاہیئے کہ تم کائنات کی ہر شے کو مسخر کر لو تاکہ اقوامِ عالم کی امامت و قیادت تمہارے حصے میں آئے۔

بصورتِ ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

تمہیں دنیا میں اس طرح رہنا چاہیئے جس طرح سمندر میں مچھلی رہتی ہے کہ جہاں جی چاہے چلی جائے۔ اس نے اپنے آپ کو پابند مسکن محصورِ مقام نہیں رکھا ہوتا۔ اس لئے سارا سمندر اس کا وطن ہوتا ہے۔

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد
چوں فلک در شش جہت آباد شد

جس نے اپنے آپ کو حدود و اطراف کی قید سے آزاد کر لیا۔ وہ آسمان کی طرح ساری دنیا میں آباد ہو گیا۔ آپ جہاں بھی جائیں وہاں آسمان موجود ہو گا۔

بوئے گل از ترکِ گل جولانگر است
در فراخائے چمن خود گستر است

خوشبو جب تک پھول کے اندر تھی، مقامی تھی۔ اس کا دائرۂ اثر و نفوذ بہت محدود تھا۔ جب وہ پھول کو چھوڑ کر باہر نکلی تو سارا صحن چمن اس سے مہک اٹھا اور وہ فضا پر چھا گئی۔

اے یک جا در چمن اندا ختی مثلِ بلبل باگلے در ساختی
چوں صبا بارِ قبول از دوش گیر گلشن اندر حلقۂ آغوش گیر

تم بلبل کی طرح ایک پھول کے وابستۂ دامن ہو کر باغ کے ایک گوشے میں پڑے ہو۔ تمہارے لئے صحن چمن کی وسعت بے معنی ہے تم اپنی جگہ سے اٹھ کر کہیں اور جا ہی نہیں سکتے۔ یہ روشِ زندگی مومن کی نہیں۔ تم اٹھو۔ صبا کی طرح چلنا سیکھو۔ اور سارے باغ کو اپنے حلقۂ آغوش میں لے لو۔

از فریبِ عصرِ نو ہشیار باش
رہ فتد اے راہرو ہشیار باش

ہمارے زمانے میں قومیت (NATIONALISM) نے بڑی شہرت حاصل کر لی ہے۔ یعنی ایک وطن کی چار دیواری میں بسنے والے افراد مل کر قوم بن جاتے ہیں۔ آئیڈیلوجی کا اختلاف و اشتراک کچھ معنی نہیں رکھتا۔ کاروانِ انسانیت کے لئے یہ بہت بڑا فریب ہے مسلمان کو اس فریب سے بچنا چاہیئے ورنہ یہ دا قوامِ مغرب کی طرح اسے بھی تباہی و بربادی کے جہنم میں لے جائے گا۔

در معنیٰ ایں کہ وطن اساسِ ملت نہیں

جیسا کہ بیان ہوتا چلا آ رہا ہے، قرآن کی رو سے قومیت کا مدار آئیڈیلوجی (ایمان) کے اشتراک پر ہے۔ وطن نسل

زبان۔ رنگ کا اشتراک کچھ معنی نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس عصرِ حاضر میں قومیت کا مدار وطن کے اشتراک پر سمجھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا (جس میں مہذب انسان بستے ہیں) درندوں کا بھٹ بن کر رہ گئی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت میں کہا ہے۔

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند — بر وطن تقسیم ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند — نوعِ انساں را قبائل ساختند

اس دور میں قومیت کی تشکیل وطن کی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی ایک عالمگیر برادری بننے کے بجائے قبائل میں تقسیم ہو گئی ہے اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔

جنتے جستند در بئس القرار
تا اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَار

سورۂ ابراہیم میں ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴/۲۸-۲۹) تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے خدا کی عطا کردہ نعمتوں کی ناسپاس گذاری کی اور اس طرح اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں جا اتارا۔ یعنی جہنم میں۔ وہ کس قدر بُرا ٹھکانہ ہے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ مغرب کے مفکر اور سیاستداں، نوعِ انسانی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے، اپنی اپنی قوم کو جہنم میں لئے جا رہے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ ہم جنت کی تلاش میں نکلے ہیں۔

ایں شجر جنت ز عالم بردہ است
تلخیٔ پیکار بار آوردہ است

حالانکہ قومیت پرستی وہ شجرِ ملعون ہے جس نے اس دنیا سے جنت کا وجود ہی نیست و نابود کر دیا ہے۔ اس نے دنیا میں جنگ کے بیج بوئے ان سے نفرت و عداوت کے پودے اُگے۔ انفرادی مفاد پرستی اور ہوسناکی کے درخت پیدا ہوئے اور اب ان میں قتل و غارت گری کے پھل آ رہے ہیں۔ (واضح رہے کہ لفظ شجر کے معنی درخت بھی ہیں اور باہمی اختلاف بھی) ان باہمی خونریزیوں اور فساد انگیزیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ

آدمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد

تمام فرزندانِ آدم ایک دوسرے سے بیگانہ ہو گئے ہیں اور دنیا میں آدمیت کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

جسدِ انسانیت سے جان نکل چکی ہے اور صرف اعضا باقی رہ گئے ہیں۔ دنیا میں اقوام تو موجود ہیں لیکن آدمیت ختم ہو چکی ہے۔

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت
ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت

مغرب میں جب مذہب کی جگہ سیاست نے لے لی اور اس شجرِ ملعون نے وہاں زمین پکڑ لی[1] تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

قصۂ دینِ مسیحائی فسرد
شعلۂ شمعِ کلیسائی فسرد

عیسائیت کی اہمیت ختم ہو گئی۔ کلیسا کے چراغ گل ہو گئے۔

اُسقف از بے طاقتی درماندۂ
مہرہا از کفِ بروں افشاندۂ

پاپائے اعظم کا اقتدار ختم ہوا۔ اس کے اختیارات سلب ہو گئے۔

قومِ عیسےٰ بر کلیسا بازدہ
نقدِ آئینِ چلیپا وا زدہ

عیسائیوں کے دل سے کلیسا کا احترام جاتا رہا۔ اس کے سکہ کا کہیں چلن نہ رہا۔

دہریت چوں جامۂ مذہب درید
مرسلے از حضرتِ شیطاں رسید

اس طرح جب دہریت نے مذہب کا پیرہن چاک کر دیا تو شیطان کی طرف سے ایک "پیغامبر" آیا۔

آں فلارنسا دئ باطل پرست
سرمۂ او دیدۂ مردم شکست

یعنی فلارنس (اٹلی) کا رہنے والا میکیاولی جو مغرب کی موجودہ سیاست کا امام اور ابوالآبا ہے۔ اس نے قوم کی آنکھوں میں ایسا سرمہ لگایا جس سے سب کی آنکھیں پھوٹ گئیں۔

نسخہ بہر شہنشاہاں نوشت
در گلِ ما دانۂ پیکار کشت

اس نے (THE PRINCE) نامی کتاب میں سیاست کے ایسے اصول دیئے جن کی رو سے ساری دنیا رزمگاہ بن گئی۔

---

[1] اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مغرب میں قومیت پرستی کے اس شجرِ ملعون کو اس لئے اگایا گیا تاکہ مذہب کی جگہ سیاست کا اقتدار قائم ہو جائے اور اس کا نتیجہ وہ کچھ ہو جائے جس کا ذکر اگلے اشعار میں کیا گیا ہے۔

فطرتِ او سوئے ظلمت بردہ رخت

حق ز تیغِ خامۂ او لخت لخت

اس کی ابلیسی فطرت کاروانِ انسانیت کو روشنی سے تاریکی کی طرف لے گئی اور اس کے قلم کی تلوار سے حق کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

بت گری مانندِ آذر پیشہ اش　　بست نقشِ تازۂ اندیشہ اش

مملکت را دینِ او معبود ساخت　　فکرِ او مذموم را محمود ساخت

اس کے فلسفۂ سیاست نے پرانے تصورات کو مٹا کر ان کی جگہ نئے نئے تصورات اور نظریات پیدا کر دیئے۔ اس نے مملکت (STATE) کو معبود (IDOL) کی حیثیت دیدی۔ جس کی قربان گاہ پر صداقت۔ دیانت۔ امانت۔ غرضیکہ ہر متاعِ انسانیت کو بلا تامل بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد

نقدِ حق را بر عیارِ سود زد

مملکت کی پرستش انتہائے مقصودِ قوم قرار پا گیا۔ جو ذرائع اس مقصد کے حصول کو کامیاب بنا دیں وہ حق۔ اور جو چیز اس کی راہ میں حائل ہو وہ باطل سمجھی گئی۔ یعنی اب حق اور باطل کا معیار ہی بدل گیا۔

باطل از تعلیمِ او بالیدہ است

حیلہ اندازی فنے گردیدہ است

اس کی تعلیم سے باطل پروان چڑھا ہے۔ اس کی رو سے فریب دہی اور حیلہ سازی نے ایک فن (ART) کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

طرحِ تدبیرِ زبوں فرجام ریخت

ایں خسک در جادۂ ایام ریخت

اس نے سیاست میں ایسی ایسی تدابیر رائج کیں جن کا مآل ہمیشہ برباد کن ہوتا ہے۔ اس نے زمانے کے راستے میں کانٹے ہی کانٹے بکھیر دیئے۔

شب بچشمِ اہلِ عالم چیدہ است

مصلحت تزویر را نامیدہ است

اس کی سیاست کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اپنی مقصد براری کے لئے جھوٹ۔ فریب۔ دغا۔ مکاری۔ دھوکہ دہی سب جائز ہے بشرطیکہ اس کا نام مصلحت رکھ لیا جائے۔ اس طرح وہ انسانیت کے کارواں کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں لے گیا۔

علامہ نے "تا سیاست مسندِ مذہب گرفت" سے آگے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میکیاولی سیاست کی یہ نئی طرح اس لئے ڈالی گئی تھی کہ مذہب کا دائرہ اثر و نفوذ ختم ہو جائے۔ دنیا میں اصول پرستی اور مستقل اقدار

کی کوئی قیمت نہ رہے اور انسانی فکر و اندیشہ پر سیاست ہی سیاست چھا جائے۔

لیکن مفہوم وہ ہو یا یہ۔ ایک بات بالکل واضح ہے میکیاولی سیاست نے اہل مغرب کی زندگی میں بار اس لئے پالیا کہ وہاں جو مذہب رائج تھا (یعنی سینٹ پال کی صیائیت) اس کی رو سے مذہب کو سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس میں "خدا کی مملکت الگ تھی اور قیصر کی الگ"۔ جب مذہب خود ہی سیاست سے الگ ہو جائے، تو سیاست پر لامحالہ شیاطین کا قبضہ ہو جائے گا۔ یورپ میں ابلیسانہ سیاست کی ترویج اس طرح ہوئی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہی کچھ خود مسلمانوں کے ہاں بھی ہو رہا ہے۔ ان کے ہاں (جب سے قرآن کا دامن چھوٹا ہے) مذہب اور سیاست الگ الگ شعبے قرار پا چکے ہیں۔ سیاست بادشاہوں کے قبضے میں ہے اور مذہب ارباب شریعت کی گرفت میں۔ حتیٰ کہ ارباب شریعت نے شرعی قوانین کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک حصہ شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) کہلاتا ہے اور دوسرا ملکی قوانین۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں بھی قومیت کا مدار اشتراکِ وطن پر ہے۔ یا نسل پرستی پر۔ (جیسا کہ اب عربی ریاستوں کو اس نقطہ پر جمع کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے) دین کو وجہِ جامعیت نہیں سمجھا جاتا۔

لہٰذا گذشتہ صفحات میں جو کچھ اہل مغرب کے متعلق کہا گیا ہے ..... خود مسلمانوں پر بھی صادق آتا ہے۔ بلکہ ان کا جرم دُہرا ہے اسلئے کہ یہ سب کچھ اُس قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے جس پر یہ ایمان رکھنے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔

اقبال اور قرآن

از:- پرویز

علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

جماعت اسلامی

(نقاب اٹھ جانے کے بعد)

"میں نے سولہ سال کے بعد ایک گم کردہ راہ قافلہ کا ساتھ چھوڑا ہے"۔

(امین احسن صاحب اصلاحی)

قارئین کو معلوم ہے کہ طلوع اسلام جماعت اسلامی کی مخالفت کرتا چلا آرہا ہے۔ طلوع اسلام کی نہ کوئی اپنی پارٹی ہے نہ ہی یہ کسی پارٹی کا ترجمان ہے۔ اس لئے جماعت اسلامی (یا کسی اور پارٹی) سے اس کی مخالفت (یا موافقت) پارٹی بازی کی بنا پر نہیں۔ اسکی اصولی وجہ یہ ہے کہ طلوع اسلام کے نزدیک جماعت اسلامی کے اغراض و مقاصد اور منہاج و مسلک (جو درحقیقت اس جماعت کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ذاتی مفاد و اغراض اور طریق فکر و کار کا دوسرا نام ہے) اسلام کے لئے، مسلمانوں کے لئے اور پاکستان کے لئے سخت نقصان رساں اور خطرناک ہیں۔ یہ جماعت جو کچھ کرتی چلی آرہی ہے اور کر رہی ہے اس کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقائق واضح طور پر سامنے آجاتے ہیں کہ

(۱) یہ ایک (دور حاضرہ کی اصطلاح میں) سیاسی جماعت ہے لیکن مذہب کا نقاب اوڑھے ہے۔

(۲) باقی سیاسی پارٹیوں کی طرح یہ بھی وقتاً فوقتاً اپنا اصول، موقف اور مسلک بدلتی رہتی ہے لیکن اپنے ہر لباس اور ہر رنگ کو صبغۃ اللہ میں رنگا ہوا بتاتی اور دین کے قالب میں ڈھلا ہوا قرار دیتی ہے۔

(۳) اس کا امیر سیاسی ڈکٹیٹروں کی طرح امر مطلق ہے لیکن اپنے ہر فیصلہ کو "خدا اور رسول" کا فیصلہ کہہ کر نافذ کرتا اور شریعت کا فرمان کہہ کر منواتا ہے۔

(۴) اس کا امیر دین کی جزئیات میں ہی نہیں بلکہ اصولوں تک میں متضاد باتیں کہتا اور اپنے لٹریچر میں محفوظ رکھتا ہے تاکہ جس وقت جس قسم کی بات کی ضرورت ہو اسے پیش کر دیا جائے۔

(۵) یہ جماعت اپنے مخالفین کی مخالفت میں ہر قسم کی دروغ بافی، بہتان تراشی اور افترا پردازی سے کام لیتی ہے۔ اور اس باب

ہیں اس کے اکثر ترجمان بازاری حربوں تک اترنے میں بھی باک نہیں سمجھتے۔

(۴) اس جماعت نے اپنے آپ کو "امت کے منتخب مصلحین افراد" پر مشتمل جماعت قرار دے کر اپنے اراکین اور متفقین کے دل میں ایسا جذبۂ رعونت پیدا کر دیا ہے۔ جس سے وہ اپنے آپ کو دین کا واحد اجارہ دار سمجھنے اور دوسروں کو ذلت کی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

ان دعاوی کے ثبوت میں طلوع اسلام گذشتہ دس سال سے 'اس جماعت کے لٹریچر سے ناقابل تردید شہادات پیش کرتا چلا آرہا ہے۔ اس کے جواب میں ان کے پاس تمسخر و استہزاء اور سب و شتم کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ چیزیں طلوع اسلام کو حق گوئی سے باز نہیں رکھ سکیں۔

کچھ عرصے سے اس جماعت کے اندر انتشار پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے اور رفتہ رفتہ اس کے ارباب لبست و کشاد کی اچھی خاصی تعداد جماعت سے الگ ہو چکی ہے۔ آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ اس جماعت کا ساتھ چھوڑنے والے اس کے (اور اسکے امیر کے خلاف وہی الزام لگا کر الگ ہو رہے ہیں) جنہیں طلوع اسلام اتنے عرصے سے پیش کرتا چلا آرہا تھا۔ مثلاً المنیر (لائلپور) اس جماعت کا مشہور ترجمان تھا۔ یہ اخبار بھی طلوع اسلام کی مخالفت میں کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ بھی جماعت کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو چکا ہے۔ اس جریدہ کی ۳۱ جنوری ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں ایک شذرہ اور ایک مقالہ میں بتایا گیا ہے کہ جماعت اسلامی کے مقاصد کیا ہیں اور ان کے حصول کے لئے وہ (مذہب کے نقاب میں) کیا کیا کچھ کرتی ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قارئین طلوع اسلام بھی ان کے مطالعہ میں شریک ہو جائیں۔ شذرہ کا عنوان ہے۔

جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کا متحدہ محاذ

اس عنوان کے تابع جریدۂ مذکور لکھتا ہے:-

اس عنوان سے "کوہستان" کی ایک خبر

"اوکاڑہ (ڈاک سے) گذشتہ روز ہفت روزہ ایشیا کے مدیر جناب نعیم صدیقی صاحب نے گرینڈ ہوٹل میں پریس کانفرنس کے نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جماعت اسلامی طریق انتخاب کے مسئلہ پر ریفرنڈم کرانے کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے مسلم لیگ اور دوسری "اسلام پسند" جماعتوں کے تعاون کی خواہشمند ہے۔ آپ نے توقع ظاہر کی کہ عام انتخابات سے قبل ان جماعتوں کا متحدہ محاذ قائم ہو جائے گا۔"

ہمارے نزدیک یہ خبر غیر متوقع نہیں ہے جماعت اسلامی نے جو نیا موقف اس ملک میں "اقامت دین" کے نام پر اختیار کیا ہے اس کا منطقی نتیجہ ہے کہ وہ مسلم لیگ اور دوسری "اسلام پسند" جماعتوں سے اتحاد کرے ۔۔۔ اور ہم دیانتہً یہ بات ضروری خیال کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اقتدار کے ذریعے یہاں اپنے جماعتی نظریات کو غالب کرنا مقصود ہے ان میں سے وہ جماعتیں جو قریب المقاصد ہوں انھیں انتخابات میں متحد ہونا چاہیئے۔

البتہ اس سلسلے میں ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ

(الف) جماعت اسلامی اب جو بھی موقف اختیار کرے خدا کے لئے وہ اسے اسلام کی تعبیر کے طور پر پیش نہ کرے۔ یہ بات نہ جماعت کے حق میں مفید ہے، اور نہ اسلام کے ساتھ ادنیٰ تعلق کی صورت میں بھی جائز کہ جو پالیسیاں آئے دن بدلنے والی ہوں اور جن میں ایک جماعت کو آج اسلام کی دشمن اور کل اسلام پسند قرار دیا جائے، آج اس کے امیدوار فاسق و فاجر اور خائن ہوں، اور انہیں ووٹ دینا بھی حرام ہو اور کل ان کے ساتھ تعاون "اسلامی ضرورت" قرار پا جائے۔ ان پالیسیوں کو اسلام اور جاہلیت کی جنگ کے طور پر پیش کرنا کارکنوں کو منتشر الذہن کرنا ہے۔ جماعت میں اس سے انتشار پیدا ہوتا ہے اور اسلام ہر نئی تعبیر سے بدنام ہوتا ہے۔

(ب) اب جو پالیسی جماعت انتخابات کے لئے وضع کر رہی ہے اسے "اقامتِ دین" کے واحد طریق کار کے طور پر ہرگز پیش نہ کیا جائے۔ اس سے مذکورہ مفاسد کے علاوہ یہ خرابی بھی پیدا ہوتی ہے کہ جماعت کے ذمہ دار حضرات کو ہر پالیسی کی تائید میں ایک تو قرآن و سنت کے دلائل کی ایسی تاویلات پیش کرنا پڑتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات کو بازیچۂ سیاست بنانے کے مترادف ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں خود اپنی متضاد باتوں کو مربوط ثابت کرنے میں ناروا طرزِ عمل اختیار کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات اس سے ثقاہت اور دیانت مجروح ہوتی ہے۔

(ج) جماعت کو ہمارا مشورہ یہ بھی ہے کہ وہ اب اس ادعاء کو ترک کر دے کہ وہ اس ملک میں "اقامتِ دین" کی واحد علمبردار جماعت ہے اور یہ اسلئے کہ ایک طرف تو وہ اپنے دعوے سے اپنے پُرجذبات اور مخلص کارکنوں کے اذہان کو اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ وہ اقامتِ دین کے واحد داعی افراد ہیں اور باقی جماعتیں اس منصب سے محروم ہیں — بلکہ یہ کہ جو جماعت یا فرد اس کی پالیسیوں اور پروگراموں کی مخالفت کرتی ہے وہ دین کی اقامت کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے اسے خدا کے سامنے اپنا جواب سوچ لینا چاہیئے — اور دوسری جانب وہ اپنی وقتی سیاسی مصلحتوں (جن کو وہ دیانتہً اپنی تحریک کے لئے مفید خیال کرتی ہے) کی وجہ سے مجبور ہوتی ہے کہ دوسری جماعتوں سے تعاون ہی نہیں اشتراکِ واتحاد بھی کرے اور ان کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بھی قائم کرے — ظاہر ہے کہ اس اتحاد کے لئے کارکنوں کا مزاج اس طرز پر ڈھلنا چاہیئے کہ وہ دوسری جماعتوں کے بارے میں دین دشمن یا دین کی اقامت سے اعراض کرنے والی جماعتیں ہونے کا یقین نہ رکھتے ہوں۔

چونکہ ہمیں خطرہ ہے کہ ہمارے ان مخلصانہ مشوروں کو موجودہ فضا میں جماعت اسلامی کی مخالفت نہ سمجھا جائے، اس لئے ہم اس ضمن میں اپنی دوسری گذارشات کو پیش کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ لیکن ہم انتہائی خلوص کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ ہم نے یہ مشورے جماعت اور اسلام دونوں کے حق میں مفید سمجھ کر دیئے ہیں اور ہماری آرزو یہ ہے کہ جماعت متضاد دعووں کی خلفشار سے نکل آئے اور اگر اسے سیاسی محاذ پر کوئی مفید کام انجام دینا ہے تو وہ اپنا موقف وہی بیان کرے جو فی الحقیقت اس کا موقف ہو۔ قول و عمل کے تضاد میں خود اس کا اپنا نقصان بھی ہے اور اسلام کے حق میں بھی ہم اس صورت کو مضر خیال کرتے ہیں"۔

آپ اس مشذرہ کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھیئے اور پھر سوچئے کہ کیا یہ چیز حرفاً حرفاً وہی نہیں جسے طلوع اسلام دس سال سے کہتا چلا آ رہا ہے؟

اس کے بعد اس مقالہ کو لیجئے جس کا عنوان ہے۔

دین کو تحریک سمجھنے کی ہلاکت آفرینیاں

اس مقالہ میں لکھا ہے:۔

"اقامت دین کے نام پر لوگوں کو اکٹھا کرنے والی جماعتیں اپنے زیر اثر افراد کے ایمان ان کے عقائد اور ان کے خیالات کی ایسی محافظ ہوتی ہیں جو لوگ من انصاری الی اللہ کی صدائے ایمان سن کر آتے ہیں اور جنہیں اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ کا کلمہ جامع اپنی دلرباقوت سے بنیان مرصوص بناتا ہے۔ یہ لوگ اسلام کا قیمتی سرمایہ اور ملت اسلامیہ کے صدف کا گوہر ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت اور انھیں اعتقادی فتنوں سے بچانا اقامت دین کی جدوجہد کا پہلا قدم ہے۔ یہ مخلص لوگ اس عظیم فرض کی داعی جماعت کو مقدس بھی سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ ان کے مومن دل کا گہرا لگاؤ بھی ہوتا ہے۔ یہ تعلق اور لگاؤ اس وقت تک اضافہ ایمان اور استحکام یقین کا ذریعہ بنتا ہے جب تک جماعت صحیح فکر اور درست عقیدے کی حامل ہو۔ اگر جماعت کے اصحاب فکر یا جماعت کا داعی یا وہ لوگ جو جماعت کے مقاصد کی تعمیر کرنے کے مقام پر فائز ہوں خود غلط ذہن ہو جائیں۔ فکر و نظر کی خرابیاں ان کے اذہان پر مسلط ہو جائیں اور ان کے اپنے نظریات جاہلیت کے اثرات بد کو قبول کر لیں۔ تو اس جماعت کے درجہ دوئم کے کارکنوں اور مخلص درکروں کی حالت انتہائی الم انگیزی کا مظہر ہوتی ہے۔ ایسی جماعت کے اصحاب فکر کا علمی و اعتقادی بگاڑ جن صورتوں میں رونما ہوتا ہے ان میں رہبانیت، تفریق دین و سیاست اور اسلام کو سیاسی نظام سمجھنے پر اہم اجمالی گفتگو ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم اسلام کے بارے میں غلط نظریات کی اس چوتھی نوع کو زیر بحث لاتے ہیں جس کا عنوان ہے" اسلام ایک تحریک ہے"۔

"اسلام ایک تحریک ہے"۔ یہ جملہ معصوم طرز پر تو اس مفہوم کو سامنے رکھ کر استعمال کیا جاتا ہے کہ اسلام جامد مذہب نہیں کہ اس میں فکر و تعقل پر ناجائز پہرے بٹھا دیئے گئے ہوں اور استنباط و اجتہاد کی گنجائش باقی نہ رکھی گئی ہو۔ یا یہ کہ وہ سائنسی ترقیات کو "جدید" ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول قرار دیتا ہو۔ لیکن اس جملے کے اس مفہوم کے ساتھ ادا کرنے کی معصومیت اس کے استعمال کی وجہ جواز نہیں بن سکتی۔ اس لئے کہ لفظ تحریک[1] اپنا جو مفہوم رکھتا ہے وہ نہ اسلام میں پایا جاتا ہے اور نہ اسلام کو دین الٰہی قرار دیئے جانے کے بعد اس کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ اسے "تحریک" کہا جائے۔

مگر ہم اس وقت اس علمی بحث کو چھیڑنا بوجوہ غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارا مطلوب اس وقت صرف یہ ہے کہ ہم دین کو تحریک قرار دیئے جانے کے ان نتائج پر گفتگو کریں جو عقلی اور عملی حیثیت سے آج تک رونما ہوئے ہیں۔

دین کے اصولوں میں ترمیم و تنسیخ

"تحریک" کا مزاج اور اس کے ترکیبی عناصر کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اصولوں میں لچک ہو اس کی کوئی بات ایسی نہ ہو جس میں حالات کے تقاضوں کی وجہ سے ترمیم نہ کی

---

[1] یعنی جن معانی میں اسے جماعت اسلامی نے استعمال کیا ہے اور جس کی تفصیل آگے چل کر آتی ہے۔ (طلوع اسلام)

جاگتی ہو اور اس کا کوئی ایسا اصول نہیں ہونا چاہیئے جو اقدام اور فتح کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ تحریک کا اصل مدعا ایک خاص مقصد تک پہنچنا ہوتا ہے خواہ اس کے لئے راستہ سیدھا اختیار کیا جائے یا بیر پھیر کا راستہ طے کرنا پڑے۔

اس کے برعکس دین ـــــ اور دین بھی وہ جو خدا نے نازل کیا ہو ـــــ اور علی الخصوص وہ دین جسے رب کائنات نے اپنے فرمان خاص سے مکمل و اکمل قرار دیا ہو۔ اس میں نہ ترمیم کی جا سکتی ہے اور نہ اس کے کسی اصول کو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی بڑی سے بڑی مصلحت کی خاطر اس کے بیان کردہ احکام و فرامین میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔

جو افراد اور جماعتیں دین کو تحریک قرار دے کر اپنے کام کا آغاز کرتی ہیں ان کے متعدد مکاتیب فکر ہر زمانہ میں پائے جاتے رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ ہمیں اس وقت ان تمام سے بحث نہیں ہمارے پیش نظر صرف وہی لوگ ہیں جو تجدید و اقامت دین کا کام کرنے کے لئے اٹھے لیکن اس وجہ سے کہ ان میں سے زیادہ با اثر حضرات دین کو تحریک سمجھتے تھے وہ تفصیلات طے کرنے کے زمانہ میں راہ حق سے اس قدر دور ہو گئے کہ تجدید کی جگہ تجدد نے حاصل کر لی اور ان کی چلائی ہوئی جد و جہد ایسے مقام پر پہنچ گئی جس سے آگے کی منازل بعینہٖ وہی ہیں جو دین کے قصر کو ڈھانے والوں کی ہیں، اور ان سے اقامت دین کے بجائے ہدم قصر دین کا خطرہ اس انداز سے لاحق ہو گیا ہے کہ آنکھیں کھول کر راستہ طے کرنے والے قدم قدم پر سرخ جھنڈیاں آویزاں دیکھتے ہیں اور پریشان ہو ہو کر کچھ واپس لوٹ رہے ہیں اور کچھ عالم حیرت میں غرق ہیں کہ چلے کدھر تھے اور نکل کہاں آئے[1]؟

ایسے حضرات کا فکر ابتداءً بھی مخدوش تھا کہ وہ دین کو "تحریک" قرار دیتے تھے لیکن ان کی اکثر و بیشتر تعبیرات ایسی تھیں جو دین کو انہی معانی میں پیش کرتی تھیں جو کتاب و سنت میں پائی جاتی تھیں لیکن جب آگے چل کر یہ مخدوش فکر اپنی اصلی شکل میں رونما ہونا شروع ہوا اور یہ سنائی دینے لگا:۔

> "ہمارا نکتۂ نظر یہ ہے کہ ہم اپنی تحریک کو خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں اگر ہمارا مقصد محض "اعلانِ حق" ہوتا تو ہم ضرور بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم بھی کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اس کی اقامت کے لئے اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے۔ اس لئے ہمیں نظریت (IDEALISM) اور حکمت عملی (PRACTICAL WISDOM) کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔"

اس مقام پر تو یہی کہا گیا تھا کہ

(الف) اعلان حق اور قیام حق دو مختلف چیزیں ہیں۔

(ب) اگر صرف اعلان حق ہی مقصود ہو تو صرف "بے لاگ حق" بات کہنے پر اکتفا کیا جا سکتا ہے لیکن

---

[1] جماعت اسلامی سے غیر مطمئن اور الگ ہونے والے حضرات کی طرف اشارہ ہے۔ (طلوع اسلام)

(ج) چونکہ مقصد "حق کو قائم کرنا" بھی ہے اس لئے نظریت (IDEALISM) کام نہیں دے سکتی۔

(د) بلکہ ضروری ہوگا کہ نظریت اور حکمت عملی کے درمیان "توازن" کو برقرار رکھا جائے۔

بات اگرچہ اصحاب نظر کی تشویش کو واقعہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن مجمل ہونے کے باعث ایسی نہ تھی کہ اسے سب کے لئے خطرے کے الارم کی حیثیت دی جا سکے۔ مگر وضاحت کا دوسرا مرحلہ آیا تو یہ آواز ذرا پھیلی اور سنائی دیا جانے لگا۔

جسے صرف تمنائیں بیان کرنے پر اکتفا کرنا ہو۔ بلکہ منزلِ مقصود کی طرف واقعی چلنا بھی ہو اسے تو ہر قدم جانچنے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لئے تمام ممکن الحصول موافق طاقتوں سے اس طرح کام لینا اور تمام موجودہ مزاحمتوں کو ہٹانے کے لئے اس طرح لڑنا ہوگا کہ گویا اس وقت کرنے کا کام یہی ہے۔

اس معاملہ میں صرف نظریت کام نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ حکمت عملی ناگزیر ہے اس حکمت کو نظرانداز کر دینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کر سکتا ہے کیونکہ یا تو وہ قافلے میں شامل ہی نہیں ہوتا یا پھر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی مگر جسے چلنا ہی نہ ہو بلکہ چلنا بھی ہو وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنیاد پر قبول نہیں کر سکتا اسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے جو قوت اس وقت اس کے پاس موجود ہے بافراہم ہو سکتی ہے اور جو جو مزاحمتیں راستے میں موجود ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے کون سی بات قابل قبول ہے اور کون سی نہیں اور کون سی بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے؟

یعنی ایک قدم آگے بڑھے کہ جس کے کندھوں پر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری بھی ہو اسے حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنے کا بھی حق حاصل ہے کہ

"کون سی بات قابل قبول ہے اور کونسی نہیں اور یہ کہ کس بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔"

پہلے مرحلہ پر نظریت اور حکمت عملی میں "توازن" کو برقرار رکھنے کا اصول بیان ہوا تھا اور اب اس توازن کی عملی شکل یہ سامنے آئی کہ حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنے والے قافلے کے قائد کو یہ حق بھی حاصل ہو گیا کہ کس بات کو قبول کرے اور کسے رد کرے۔ اب تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔

آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ

(الف) آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے اور

(ب) جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی کے ساتھ جما رہے۔ مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جوں کی توں کبھی نہیں چل سکتی۔ یعنی "واقعات کی دنیا" میں جس طرح یہ ممکن نہیں کہ آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل پر ہی نظریں گاڑے رہے اور کسی دوسری چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی سے جما رہے۔ بلکہ

جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل پر ہی رکھوں گا اور پھر دورانِ سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثناء اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہیں رکھوں گا وہ عملاً اس مقصد کے لئے کوئی کام نہیں کر سکتا۔"

مزید وضاحت :-

"یہاں (واقعات کی دنیا میں) آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمت عملی کا ملنا ضروری ہے وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راستے کی کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیئے کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کن کن مواقع سے بچنے کو مقصد کی اہمیت دینی چاہیئے۔

اور

کن اصولوں میں اہم تر مصالح کی خاطر حسب ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیئے۔"

دو باتیں واضح ہوئیں :-

ایک تو یہ کہ آئیڈیلزم اور حکمت عملی دونوں میں سے فیصلہ کی باگ ڈور حکمت عملی (PRACTICAL WISDOM) کے ہاتھ میں ہے ("وہی یہ طے کرتی ہے کہ.....")

دوسرے یہ کہ

(حکمت عملی ہی یہ طے کریگی کہ) اقامت دین کی علمبردار جماعت جن اصولوں کو پیش کرتی رہی ہے ان میں سے کون سے اصول ایسے ہیں جن میں "لچک" پیدا نہیں ہو سکتی اور کون سے اصول ایسے ہیں جن میں "اہم تر مصالح" اور "ضرورت" کی خاطر لچک کی "گنجائش" نکالنا چاہیئے۔"

چوتھا مرحلہ

(حضور کے اسوہ سے اصولوں میں لچک پیدا کرنے بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کی ایک مثال پیش کرنے کے بعد وضاحت ہوتی ہے) یہ "(مثال) اس بات کی صریح مثال ہے کہ ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی نسبت بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے۔ حکمت عملی ہی نہیں حکمت دین کے بھی خلاف ہے۔"

آخری حد ــــــ

مگر یہ معاملہ اسلام کے سارے اصولوں کے بارے میں یکساں نہیں ہے۔ جن اصولوں پر دین کی اساس قائم ہے مثلاً توحید اور رسالت وغیرہ ان میں عملی مصالح کے لحاظ سے لچک پیدا کرنے کی کوئی مثال حضورؐ کی سیرت میں نہیں ملتی نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔"

مراد یہ ہے کہ

ایک طرف، دین کے "بعض اصول" ہوں اور دوسری جانب "بعض دینی مقاصد" ہوں اور دین کے ان بعض اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے ان "بعض دینی مقاصد" کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو "حکمتِ عملی" ہی نہیں "حکمتِ دین" کا تقاضا ہے کہ ان "بعض دینی اصولوں" پر عمل کرنے پر اصرار نہ کیا جائے۔۔۔۔ اگر ایسا اصرار کیا گیا تو یہ حکمتِ عملی ہی کی خلاف ورزی نہیں ہوگی "حکمتِ دین" کی مخالفت بھی ہوگی۔ اور جس شخص کو اسلامی تحریک سے کر چلنا ہے اور جو صرف اعلانِ حق پر ہی اکتفا کرنا نہیں چاہتا بلکہ یہ مقصد بھی اپنے سامنے رکھتا ہے کہ دین کو قائم بھی کیا جائے۔ ایسے شخص کو یہ حق حاصل ہے۔۔۔۔ نہیں اس پر "اقامتِ دین" ہی کی جانب سے یہ فرض عاید ہوتا ہے۔۔۔۔ کہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ دین کے کون سے اصول ایسے ہیں جن میں کسی مصلحت اور ضرورت کی وجہ سے لچک پیدا نہیں کی جا سکتی اور کون سے اصول وہ ہیں جن میں لچک پیدا کی جا سکتی ہے۔

اور

اس بات کا بھی فیصلہ ہو گیا کہ جن اصولوں میں لچک پیدا نہیں کی جا سکتی وہ ہیں اساساتِ دین کے اصول یعنی توحید و رسالت وغیرہ (یعنی ایمانیات) ان میں سے نعوذ باللہ لچک اور ان کی خلاف ورزی کی کوئی مثال آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں نہیں ملتی۔ البتہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل سے اس بات کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے جو اصول اسلامی نظام کے پیش فرمائے تھے جب عملاً اسلامی نظام کو قائم کرنے کا مرحلہ آیا تو حضورؐ نے ان اصولوں میں لچک پیدا کی۔

مثلاً

• اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔

اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا، اور حضورؐ نے بھی بارہا اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کی امت کے مناصب میں واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن

جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ "الائمۃ من قریش" امام قریشیوں میں سے ہوں۔

سلہ۔ معاذ اللہ (طلوعِ اسلام)

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے ایسے اصول میں اتنے بڑے استثنا کی گنجائش کیوں پیدا کی گئی؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس وقت عرب کے حالات میں کسی غیر عرب تو در کنار کسی غیر قریشی خلیفہ کی خلافت بھی عملاً کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے حضورؐ نے خلافت کے معاملہ میں مساوات کے اس عام اصول پر عمل کرنے سے صحابہ کو روک دیا کیونکہ اگر عرب ہی میں حضورؐ کے بعد اسلامی نظام درہم برہم ہو جاتا تو دنیا میں اقامت دین کے فریضہ کو کون انجام دیتا؟

چند لمحات کے لئے الائمۃ من قریش کی حدیث پر بحث[1] کو ملتوی کیجئے اور اس فکر و فلسفہ کا تجزیہ کیجئے جو تحریک اقامت دین کے نام سے سیدالرسل کی جانب منسوب کیا جا رہا ہے۔

صورت واقعہ یوں بنتی ہے کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی نظام قائم کرنے کی تحریک جاری فرمائی اور اس کے چند اصول بیان فرمائے ان اصولوں میں بعض تو وہ تھے جن کا تعلق ایمانیات سے تھا۔ مثلاً ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت وغیرہ۔ کفار مکہ نے بارہا مطالبہ کیا کہ حضورؐ! ان اصولوں میں نرمی اور لچک پیدا کیجئے تو ہم آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میرے دائنے ہاتھ پر سورج رکھ دو اور بائیں ہاتھ میں چاند تھما دو اور مطالبہ کرو کہ توحید وغیرہ عقائد میں کوئی لچک پیدا کر دوں تو یہ ممکن نہیں۔ چنانچہ حضورؐ کی پوری زندگی میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ان اصولوں میں لچک اور استثنیٰ پیدا کرنے کا ثبوت پیش کیا جا سکے۔

ان کے ساتھ ایک دوسری قسم کے اصول بھی آنحضورؐ نے پیش فرمائے مثلاً

جو اسلامی نظام میں قائم کروں گا اس میں ہر اسود و ابیض اور عربی و عجمی کو مساوی درجہ دیا جائے گا۔

سب کو جان و مال اور عزت و آبرو کی آزادی حاصل ہوگی۔

جو شخص اس نظام کو قبول کرے گا اسے امن کی ضمانت دی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

لوگوں نے اس دعوت کو سنا ان اصولوں کو اپنے لئے مفید محسوس کیا پھر فارس، روم، ایران اور عرب دنیا کے تمام خطوں سے لوگ آئے اور انہوں نے اپنی خدمات اسلامی نظام کے قائم کرنے کے لئے پیش کر دیں۔

---

[1] اس حدیث پر اسی اشاعت میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک اہم اور جامع مقالہ دیا جا رہا ہے جو توقع ہے کہ وضاحت مدعا کے لئے کافی ہوگا۔ (مدیر)

یہی وہ مقامات ہیں جہاں طلوع اسلام کہا کرتا ہے کہ جو حدیث قرآن کے خلاف ہو اس کے متعلق سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ نبی اکرمؐ کی ہے ہی نہیں۔ حضورؐ کی طرف غلط منسوب ہے۔ اس سے بات صاف ہو جاتی ہے۔

اسلامی نظام کی اس محمدی تحریک کو شدید ترین کشمکش سے واسطہ پڑا۔ بیسیوں لڑائیاں اس کے لئے لڑی گئیں۔ ہزاروں کارکن ان لڑائیوں میں شہید ہوئے ـــــ اور بالآخر وہ لمحہ آیا کہ یہ نظام عملاً قائم ہوا۔

اس مرحلہ پر قائد تحریک (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ یہ تھا کہ آپ نے اپنی تحریک کے آغاز میں لوگوں کے سامنے جو آئیڈیل (IDEAL) پیش فرمایا تھا اس کے ان اصولوں کو جو اول الذکر قسم (ایمانیات) کے اصولوں سے الگ تھے (مثلاً مساوات، تمام کو خلیفہ بننے کا حق دیا جانا اور سب کو شخصی آزادی اور جان و مال کی عصمت کی حفاظت کی ضمانت۔ وغیرہ) ان کے بارہ میں یہ طے فرمالیا کہ ان میں سے جو اصول حکمت عملی (PRACICAL WISDOM) سے متصادم ہوں گے۔ یعنی جن پر عمل پیرا ہونے سے "اقامت دین" کی تحریک کو نقصان پہنچے گا ان میں "استثنے" اور لچک پیدا کرلی جائے گی۔

چنانچہ حضورؐ کی زندگی میں اس کی جو بے شمار مثالیں ملتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب پوری مملکت میں اسلامی خلافت قائم کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو آپؐ نے اسلامی مساوات پر عمل کرنے سے صحابہ کو روک دیا: اور حکم صادر فرمایا کہ دیکھنا کہیں تمام عجمیوں اور عربیوں ـــــ کو یہ موقعہ نہ دے دینا کہ جس کو پسند کرو خلیفہ منتخب کرو ـــــ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تحریک میرے بعد فوراً ہی ختم ہو جائے گی۔ بلکہ تم ایسا کرو کہ اسلامی مساوات کے اصول میں ایک اہم "استثناء" پیدا کرو۔ میں یہ خود اپنے پیش کردہ اس اصول میں ایک اہم استثنا پیدا کرتا ہوں اور تمہیں نظام اسلامی کی تحریک کے دوران پیش کئے گئے اس اصول مساوات پر عمل کرنے سے روکتا ہوں۔ اب تم ایسا کرنا کہ خلیفہ صرف قریش میں سے منتخب کرنا۔

غور فرمایئے ـــــ اگر یہ طریق کار خدا کے آخری نبیؐ نے اختیار فرمایا تھا ـــــ اور اگر "اسلامی تحریک" اس اسوہ حسنہ کے مطابق اسی طریق کار کو اپنا معمول بناتی ہے۔ اور ہر کوئی ایسی جماعت جو اقامت دین کی علمبردار ہو وہ اس اصول کو بطور فلسفہ اور عقیدہ کے اختیار کرلیتی ہے کہ

اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جو اصول بیان کئے جائیں اور جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے۔ جب اسلامی نظام کو عملاً قائم کرنے کا وقت آئے گا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے علاوہ تحریک کے مفاد کے لئے جس اصول میں ضروری خیال کرے استثنیٰ پیدا کر لے اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے جو ضمانت اس تحریک نے عوام کو اپنے ابتدائی دور میں دی ہو۔ اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لئے مضر خیال کرے ساقط کردے (جیسا کہ مبینہ مثال میں حضورؐ نے مساوات اور حق خلافت ایسے اہم اصول اور ضمانت پر عمل کرنے سے صحابہ کو روک دیا) تو اس اسلامی تحریک اور اس اقامتِ دین کی جدوجہد ـــــ اور ان طالع آزما سیاستدانوں کی تحریکات کے مابین کیا فرق باقی رہ جائے گا جو حصولِ اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں۔ بہت سے حسین وعدے عوام سے کرتے ہیں اور انہی اصولوں اور وعدوں کی بنیاد پر وہ لوگوں کی حمایت و تائید حاصل کرتے ہیں لیکن جب انہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اقتدار کو قائم رکھنے کی عملی مشکلات سے مجبور ہو کر ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ اگر یہ دروازہ یوں کھلتا ہے کہ اسلامی نظام کی تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہے کہ اسلام کے بنیادی معتقدات کے علاوہ دوسرے اصولوں میں لچک پیدا کرلے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آج اس نے حکمت عملی کو معیار قرار دے کر یہ طے کیا کہ مساوات کے اصول پر عمل ممکن نہیں اور اس پر عمل کرنے سے اسلامی تحریک کو نقصان پہنچے گا اس لئے مساوات کے اصول پر ایک پابندی عائد کر دو، کل وہ یہ محسوس کرے کہ اب کشمکش احوال متقاضی ہے کہ شخصی آزادی کے حصول پر بعض پابندیاں عائد کی جائیں لہٰذا اسے محدود کر دیا جائے۔ پرسوں اس کی رائے یہ ہے کہ اس وقت جمہوریت؛ اسلامی مملکت اور اسلامی نظام کے لئے راس نہیں آتی اور اگر اس پر عمل کیا گیا تو اقامت دین کی جدوجہد کو نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا اب محدود جمہوریت (CONTROLLED DEMOCRACY) رائج ہونی چاہیئے۔ اور پرسوں رائے یہ محسوس ہو کہ اب دستوری نظم کا چلانا اسلامی تحریک کے لئے مفید نہیں لہٰذا اب دستور کو معطل کر کے صدر راج یا اس سے آگے بڑھ کر مارشل لاء نافذ کرنا چاہیئے اور وہ اسے "حکمت دین" قرار دے کر ان لوگوں کو مصلحت دین کے مخالف قرار دے جو اسلامی نظام کے اصول جمہوریت پر عمل کرنے پر "اصرار" کریں۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار مفسدے صرف اس فلسفہ کو قبول کر لینے سے پیدا ہوتے ہیں کہ جو اصول اقامت دین کی تحریک کے ادل دور میں پیش کئے جائیں جب عملاً دین کو قائم کرنے کا مرحلہ آئے تو جس شخص کو اس قافلہ کو لے کر چلنا ہو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ نظریت کے ساتھ حکمت عملی کو متوازن کرے اور پیش آمدہ موانع کو سامنے رکھ کر اسلامی نظام کے اصولوں میں سے جس کو ضروری خیال کرے قبول کرے اور جسے مضر خیال کرے اسے رد کر دے۔

اور یہ مفسدہ دین کے لئے عظیم فتنہ بن جاتا ہے۔ جب اس فلسفہ کے متعلق ذہن یہاں تک پہنچ جائے کہ قول و عمل کی یکسانیت کے سب سے بڑے علمبردار خدا کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بے شمار مثالیں اس امر کی ملتی ہیں کہ حضورؐ نے دعوت کے زمانہ میں جو اصول پیش فرمائے تھے، اقامت دین کے عملی زمانہ میں ان میں سے توحید و رسالت کے اساسی اصولوں کے علاوہ دوسرے اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔

دین کو تحریک قرار دے کر اقامت دین کے لئے جدوجہد کی یہ پہلی اور عظیم ہلاکت ہے جو اس جماعت کو بے اصولی اور طالع آزما سیاسی جماعت بنا کر رکھ دیتی ہے جس کا حقیقی سرمایہ ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس پر اعتماد رکھیں کہ وہ اقتدار کے حصول سے پہلے جو وعدے عوام سے کرتی ہے اور جو اصول اسلامی نظام کے وہ اپنی دعوت میں پیش کرتی ہے جب عمل کا زمانہ آئے گا اور جب وقت اس جماعت کو اقتدار حاصل ہوگا تو یہ ان اصولوں پر قائم رہے گی، اور ہر قسم کی مزاحمتوں کے علی الرغم اپنے پیش کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہوگی۔ (ختم)

ہمارے خیال میں یہ مقالہ کسی تبصرہ یا توضیح کا محتاج نہیں۔ اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس جماعت کی خطرناک پالیسی کے متعلق طلوع اسلام جو کچھ کہتا تھا۔ وہ کس قدر حق و صداقت پر مبنی تھا۔

ہدیۂ تبریک | جو حضرات اس جماعت کی خطرناک پالیسی کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھ کر الگ ہوئے (یا جو ہو رہے ہیں) ہمارے نزدیک وہ

درخورِ صد مبارکباد ہیں۔ اس لئے کہ اپنے مسلک کی غلطی کو محسوس کرکے، اس کا اعتراف کرلینا اور اس کے بعد اس مسلک سے الگ ہوجانا من عزم الامور ہے۔ اس ضمن میں ان حضرات سے ہماری دو تین گذارشات ہیں۔

ایک، تو یہ کہ جب آپ حضرات نے اپنے سابقہ (غلط) مسلک کو چھوڑا ہے تو نیا راستہ اختیار کرتے وقت جذبات سے بالکل کام نہ لیں بلکہ خدا کی راہ نمائی کی روشنی میں اپنی عقل و بصیرت سے کام لیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس طرح دین کی صحیح راہ سامنے آجائے گی۔

دوسرے یہ کہ آپ حضرات اسے اچھی طرح سمجھ لیں کہ آپ کے فیصلہ کا اثر آپ کی ذات تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس سے وہ لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں جو دین کے معاملہ میں آپ کو صاحب بصیرت سمجھتے ہیں۔ آپ کا غلط قدم اس پورے کے پورے گروہ کو غلط منزل کی طرف لے جانے کا موجب بن جاتا ہے۔ محترم اصلاحی صاحب نے جماعت اسلامی سے قطع تعلق کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ

"میں نے سولہ سال کے بعد ایک گم کردہ راہ قافلہ کا ساتھ چھوڑا ہے۔" (نوائے وقت ۱/۵۸ ۳۰)

کون کہہ سکتا ہے کہ اس سولہ سال کے عرصہ میں آپ کی اس راہ گم کردہ قافلہ کی معیت سے کس قدر افرادِ امت گمراہ ہوئے ہوں۔ اس لئے آپ حضرات کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ آپ ان افراد اور اداروں کے موقف و مسلک پر جو جماعت اسلامی کی مخالفت کرتے تھے (اور اس کی وجہ سے ان کی طرف سے آپ کی بھی مخالفت ہوتی تھی) ٹھنڈے دل سے نظر ثانی کریں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ (اس طرح) اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ لوگ جماعت اسلامی کی مخالفت میں سچے تھے۔ اور جماعت کی طرف سے ان کے خلاف جو کچھ کہا جاتا تھا وہ بیشتر افتراء پردازی اور اتہام تراشی پر مبنی تھا۔ اور اس میں (دین کے مفاد کے بجائے خود) امیر جماعت کے مفاد کے تحفظ کا جذبہ زیادہ کارفرما تھا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو صحیح فیصلہ پر پہنچنے اور اس پر استقامت پذیر ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

"مزاجِ شناسِ رسول"

پیشوایانہ ڈکٹیٹرشپ کی راہیں کس طرح ہموار کی جارہی ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کتاب کو پڑھیئے۔ تاکہ جماعت اسلامی کا صحیح موقف آپ کے سامنے آجائے۔

قیمت :- چار روپے

ڈائرکٹر عالم اسلامی (لاہور)

ریاست کا اسلامی تصور

(از امین احسن اصلاحی صاحب)

ریاست کا اسلامی تصور اس اصطلاح کے اندر چھپا ہوا ہے جو اسلام نے ریاست کی تعبیر کیلئے اختیار کی ہے۔ اسلامی لٹریچر پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام نے اپنے اصولوں پر قائم شدہ سیاسی تنظیم کے لئے ریاست یا سلطنت یا حکومت کی اصطلاحیں نہیں اختیار کی ہیں بلکہ خلافت یا امامت یا امارت کی اصطلاحیں اختیار کی ہیں۔ اس وجہ سے ریاست کا اسلامی تصور واضح کرنے سے پہلے ان اصطلاحات پر غور کرنا اور ان کے مضمرات کو سمجھنا ضروری ہے۔

خلافت اور امامت و امارت کی اصطلاحیں ہماری بعض فقہ کی کتابوں میں بالکل مترادف المعنی اصطلاحات کی حیثیت سے استعمال ہوگئی ہیں جس کے سبب سے بعض اوقات کچھ خلط مبحث سا ہو جاتا ہے لیکن اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان اصطلاحات کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لئے استعمال ہوئی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے ارادوں کی تنفیذ کرتی اور اس کے مقصودوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھئے کہ جو فرق STATE اور GOVERNMENT کے درمیان ہے اسی قسم کا فرق خلافت اور امامت کے درمیان ہے۔

اس تمہید سے یہ بات واضح ہوئی کہ ریاست کا اسلامی تصور سمجھنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ حقیقت ملحوظ رکھنی ہے کہ اسلام میں ریاست محض ایک ریاست نہیں ہے بلکہ وہ خلافت ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی ہوگی کہ کسی چیز کا صحیح تصور اس کی معیاری شکل ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے خلافت کی بھی یہاں صرف معیاری شکل ہی زیر بحث ہے۔ اس کی بگڑی ہوئی شکلیں جن کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں اس بحث میں ہمارے لئے کارآمد نہیں ہو سکتیں۔

اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ہمیں سب سے پہلے اس خلافت کا سراغ انسانی فطرت اور انسانی معاشرے کے اندر لگانا چاہیئے خوش قسمتی سے اس بارے میں اسلام نے ہمیں اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے کہ سیاسی فلسفیوں کی طرح انسان کے ابتدائی سیاسی تصورات سے متعلق ہمیں اٹکل کے تیر تکے چلانے پڑیں۔ بلکہ وحی الٰہی نے ہمارے سامنے ایک واضح علم الانسان بھی رکھ دیا ہے جس سے ہم اس خلافت کی اصل اور ابتدا بھی معلوم کر سکتے ہیں اور اس کی روشنی میں اس کے بنیادی تصورات بھی سمجھ سکتے ہیں۔ میں یہاں اس علم الانسان کو

قرآن سے اخذ کر کے اپنے الفاظ میں مختصر طور پر پیش کرتا ہوں۔

قرآن میں اس خلافت کی ابتدا اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کرنا چاہا تو سب سے پہلے فرشتوں کے سامنے اپنے اس ارادے کا اظہار فرمایا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں کے علم میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم نہیں تھی اس وجہ سے ان کے حلقے میں سوال پیدا ہوا کہ اگر اس نئی مخلوق کے پیدا کرنے سے مقصود اللہ تعالیٰ کا محض یہ ہوتا کہ اس کی تسبیح و تقدیس کرے تو اس کو پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کام کے لئے تو ہم پہلے سے موجود ہی ہیں۔ لازماً یہ مخلوق خدا کے نائب کی حیثیت سے اس زمین کا انتظام و انصرام سنبھالے گی۔ اور اس کے خلیفہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کو خدا کی طرف سے کچھ اختیارات بھی تفویض ہوں گے پھر یہاں سے ان کو یہ اندیشہ بھی ہوا کہ اگر اس مخلوق کو اختیار بھی ملا تو یہ زمین میں عدل و انصاف کے بجائے خونریزی اور فساد برپا کرنے والی مخلوق بن جائے گی۔ اپنا یہ اندیشہ فرشتوں نے ایک سوال کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جواب دیا کہ یہ شبہ تمہیں صرف اس وجہ سے لاحق ہوا ہے کہ تمہاری نظر میری پوری اسکیم پر نہیں ہے چنانچہ ان کو آدم کی ذریت کا مشاہدہ کرایا گیا اور پھر ان سے سوال کیا گیا کہ اگر آدم اور ان کی اولاد کے بارے میں تمہارا یہ گمان صحیح ہے تو بتاؤ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب زمین میں فساد ہی برپا کرنے والے ہیں یا ان میں نیکی یا انصاف پھیلانے والے بھی ہیں؟ فرشتوں نے نہایت ادب کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو (جو پہلے سے اپنی ذریت کے ناموں سے واقف ہو چکے تھے) حکم دیا کہ وہ اپنی ذریت کے نام ان فرشتوں کو بتائیں۔ آدم نے فرشتوں کو اپنی ذریت کے ناموں سے آگاہ کیا اور ان کی نسل میں جو انبیاء و رسل اور مجددین و مصلحین پیدا ہونے والے تھے ان کا تعارف کرایا۔

اس سے فرشتوں پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آدم اور اولاد آدم کو جو خلافت عطا ہو رہی ہے۔ اگرچہ وہ اختیار و ارادے کی آزادی کے ساتھ عطا ہو رہی ہے، جس سے خرابی کے بھی اندیشے ہیں لیکن ساتھ ہی اس اختیار و ارادہ کی حدبندی اور انسان کی اصلاح و تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب و شریعت بھی نازل فرمائے گا اور اپنے نبی اور رسول بھی بھیجے گا اس انکشاف سے فرشتوں پر اللہ تعالیٰ کی اسکیم واضح ہو گئی اور وہ مطمئن ہو گئے۔

قرآن نے تاریخ انسانی کے اس بالکل ابتدائی ماجرے کو محض ایک کہانی کے طور پر نہیں سنایا ہے۔ بلکہ اس کے سنانے کا اصل مقصود چند اجتماعی و سیاسی حقیقتوں کی ابتدا کا سراغ دینا ہے اس سے خلافت کے تصور سے متعلق جو حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ مندرجۂ ذیل ہیں۔

ایک یہ کہ خلافت کا وجود انسانی فطرت کا بروز ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان کو خارج سے لاحق ہو گئی ہو بلکہ خدا نے خود اس کو اس منصب کے لئے پیدا کیا ہے اور خود اس کا شعور اس کے اندر ودیعت کیا ہے وہ جب سے بھی اس دنیا پر ہے اس شعور کے ساتھ ہے اور اسی شعور نے اس کو سیاسی زندگی پر اکسایا ہے۔ اس نے سیاسی زندگی مصنوعی طور پر نہیں اختیار کیا ہے اور نہ بے ضرورت اختیار کی ہے بلکہ یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے جس کے پورا ہوئے بغیر اس کی شخصیت کی تکمیل ہو نہیں سکتی۔

دوسری یہ کہ اس زمین پر انسان کا فطری منصب خودمختار اور مطلق العنان ہستی کا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور نائب کا ہے اس کو ایک خاص دائرے کے اندر تصرف کا اختیار تو حاصل ہے لیکن یہ اختیار اس کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا تفویض کردہ ہے۔ اس وجہ سے اس کا وہی تصرف جائز اور معقول ہے جو خدا کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہو، ان سے ہٹ کر نہ ہو۔ اس نیابت کے تصور کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کو اپنے ہر اس تصرف کے لئے جواب دہی کرنی پڑے گی جو اصل مستخلف یعنی اللہ تعالیٰ کے منشا کے خلاف ہو۔

تیسری یہ کہ اس میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے، نہ کہ انسانوں کی۔ اس میں قانون سازی اور تصرف کے جو اختیارات انسانوں کو حاصل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے تحت ہیں۔ یا پھر ان دائروں کے اندر ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے۔

چوتھی یہ کہ منصب تخلیق کے اعتبار سے تو اس منصب کے اہل سارے ہی انسان ہیں، اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے جو صلاحیتیں درکار ہیں وہ بھی ہر ایک کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان اس منصب پر مجبور نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس کو اختیار کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ وہ خدا کے حدود کا پابند رہ کر اس کا خلیفہ بھی بن سکتا ہے اور ان حدود سے آزاد ہو کر اس کا باغی بھی بن سکتا ہے۔ جس طرح ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا تو کیا ہے اپنی بندگی ہی کے لئے لیکن کسی کو اس بندگی کے لئے مجبور نہیں کیا ہے بلکہ ہر ایک کو آزاد چھوڑا ہے۔ وہ بندگی کرے یا نہ کرے، اسی طرح اس خلافت پر بھی اس نے کسی کو مجبور نہیں کیا ہے۔

پانچویں یہ کہ اس منصب کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں انسان اگر اس اسکیم کی پابندی نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے پسند فرمائی ہے تو انسان کا فساد اور خوں ریزی میں مبتلا ہو جانا بہت اقرب ہے۔

چھٹی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مبہم نہیں چھوڑا ہے کہ وہ اپنی زمین کے انتظام کے سلسلے میں کس چیز کو پسند کرتا ہے اور کس چیز کو پسند نہیں کرتا۔ بلکہ عین منصب خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی پسند و ناپسند اور اپنے احکام و ہدایات سے باخبر رکھنے کا انتظام کرے۔ چنانچہ فرشتوں کو جو شبہ تھا کہ انسان خلافت پا کر فساد و خوں ریزی میں مبتلا ہو جائے گا وہ اسی بات سے دور ہوا کہ اولاد آدم میں نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی جاری ہوگا جو انسان کی ہدایات کے لئے اللہ تعالیٰ اپنی کتابیں اور شریعتیں بھی نازل فرماتا رہے گا۔

ساتویں یہ کہ خلافت کی اساس قومیت، وطنیت، نسل اور رنگ کے تصورات پر نہیں ہے بلکہ یہ اپنے مزاج اور اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک اصولی اور جہانی ریاست ہے۔

آٹھویں یہ کہ یہ نظام کامل مساوات کے اصول پر قائم ہے۔ اس میں خلافت کا منصب کسی خاص شخص یا گروہ یا طبقہ کو حاصل نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کو حاصل ہے۔ اس میں اگر کسی کو کسی پر ترجیح حاصل ہو سکتی ہے تو وہ محض اہلیت و صلاحیت کی بنا پر اور یہ بھی سب کے لئے

اور مرضی سے۔

اوپر ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ خلافت اختیار پر مبنی ہے نہ کہ جبر پر۔ اس اختیار کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں کو زمین میں اقتدار بخشے اور یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کرے کہ وہ اپنی من مانی چلاتی ہیں یا اس اقتدار کو خدا کے مقرر کردہ حدود کا پابند رکھتی ہیں جو اس اقتدار کو پا کر خدا سے بغاوت کی روش اختیار کرتی ہیں وہ مجرم قرار پاتی ہیں اور امتحان کی مقررہ مدت گذار چکنے کے بعد وہ فنا کر دی جاتی ہیں۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی ان سنت کا ذکر سورۂ یونس کی آیات ۱۳۔۱۴ میں اس طرح فرمایا ہے۔

"اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جبکہ انھوں نے ظلم کیا اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ ایسا ہی بدلا دیتے ہیں ہم مجرموں کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد زمین میں تم کو خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو"۔

یہ خلافت بالقوہ اگرچہ سارے ہی انسانوں کو حاصل ہے لیکن بالاستحقاق یہ صرف ان کو حاصل ہے جو اس کا حق ادا کریں۔ چنانچہ حضرت داؤدؑ کو اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اپنا خلیفہ قرار دیا ہے اس لئے کہ ان کی حکومت اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق تھی

"اے داؤدؑ! ہم نے تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا تو تم لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو"۔ ۳۸ ص

اس خلافت کے حقیقی اہل درحقیقت انبیاء علیہم السلام ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے طریقے پر اس کی ذمہ داریاں ادا کریں۔ جو لوگ خدا کی بندگی اور اطاعت کے لئے منظم ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس خلافت کا خلعت عطا فرماتا ہے چنانچہ قرآن میں فرمایا ہے۔

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے اچھے کام کئے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں اسی طرح خلافت دے گا جس طرح اس نے ان سے اگلوں کو دی اور ان کے لئے ان کے اس دین کا بول بالا کرے گا جس کو ان کے لئے پسند فرمایا اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی بندگی کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے"۔

یہی خلافت کی اصل شکل ہے۔ جب تک یہ اپنی ان خصوصیات پر باقی رہے۔ یہ زمین کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ یہ خصوصیات اگر کم ہونی شروع ہو جائیں تو یہ اس کے بگاڑ کی صورتیں ہوں گی اور اس بگاڑ کے مختلف درجے ہیں۔ ایک خاص درجے تک بگاڑ اس کو خلافت کے دائرے سے خارج نہیں کرتا لیکن اگر یہ بگاڑ اس کی بنیادی خصوصیات کو ختم کر دے تو پھر یہ خلافت، خلافت نہیں باقی رہ جاتی بلکہ بغاوت اور فساد فی الارض بن جاتی ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا کہ ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست (بالفاظ دیگر خلافت) میں کس اعتبار سے اشتراک اور کن پہلوؤں سے اختلاف ہے۔ ارسطو نے انسان کی یہ جو تعریف کی ہے کہ "وہ حیوان ناطق ہے" یہ تعریف جس طرح ایک کافر پر صادق آتی ہے اسی طرح ایک مومن پر بھی صادق آتی ہے۔ کیونکہ پیدائشی اور جبلی دائروں میں دونوں ایک ہی طرح کی فردیات اور ایک ہی قسم کے داعیات رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہر شخص جانتا ہے کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک کافر کے اصول زندگی اور ہیں اور ایک مسلم کے اصول زندگی اور ہیں۔ اسی طرح ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست میں بھی جہاں تک ان کے ظاہری ڈھانچے اور ان کے

مادی اجزائے ترکیبی کا تعلق ہے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ایک عام ریاست جس طرح اپنے وجود پذیر ہونے کے لئے اس امر کی محتاج ہے کہ اس کو ایک انسانی معاشرہ حاصل ہو۔ اس کے قبضے میں ایک مخصوص علاقہ ہو۔ وہ داخلی طور پر با اقتدار اور بیرونی حیثیت سے خود مختار ہو۔ اسکے پاس ایک سیاسی ادارہ (گورنمنٹ) ہو جو اس کے ارادوں کی تنفیذ اور اس کے مقاصد کی تکمیل کر سکے اسی طرح اسلامی ریاست یا خلافت بھی اپنے وجود پذیر ہونے کے لئے ان ساری چیزوں کی محتاج ہے۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا لیکن جہاں تک دونوں کے اصول اور مقاصد کا تعلق ہے دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔

طلوعِ اسلام ہمارے ہاں جو غیر قرآنی تصورات مسلمہ عقائد کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، ان میں ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ یا نائب بنایا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے پہلے تو عام انسانوں کو خلیفۃ اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اس نیابت الٰہیہ کو سمٹا کر صاحبِ اقتدار ہستیوں (یعنی حکمران طبقہ) میں محدود کر دیا جاتا ہے۔ یعنی اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ اسلام میں حکمران طبقہ خدا کے نائب کی حیثیت سے حکومت کرتا ہے۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ یہ عقیدہ عیسائیوں کے عقیدہ "بادشاہ کے حقوقِ خداوندی" (DIVINE RIGHTS OF THE KINGS) کا چربہ ہے۔ اس کی دلیل قرآن سے نہیں ملتی (قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا) نہ ہی نبی اکرمؐ نے اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ قرار دیا تھا۔ حضورؐ کے بعد آپ کے خلفاء نے بھی اپنے آپ کو خلیفۃ الرسول ہی کہا تھا۔ نہ کہ خلیفۃ اللہ۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اگر کسی ہیئتِ حاکمہ کو خلیفۃ اللہ ہونے کا حق حاصل ہو سکتا ہے تو ان حضرات سے بڑھکر اس حق کے حقدار اور کون ہو سکتے تھے؟ خلیفہ کے معنی جانشین یا (SUCCESSOR) کے ہیں۔ خلیفۃ الرسول کی اصطلاح انہی معانی کو واضح کرتی ہے۔ چونکہ ایک صاحبِ اقتدار کی جانشینی میں اقتدار اور حکومت ساتھ آتے ہیں اس لئے خلیفہ کے معنی ایسے جانشین کے ہیں جو صاحبِ اقتدار ہو۔

بنا بریں حضرت ابوبکرؓ نبی اکرمؐ کے صاحبِ اقتدار جانشین (خلیفۃ الرسول) تھے۔ خلیفۃ اللہ (خدا کے جانشین) نہیں۔ پھر خلیفۃ اللہ (خدا کا جانشین) کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک مملکت (STATE) کا تعلق ہے قرآن کی رو سے بات بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے ابدی اصول و قوانین وحی کی رو سے عطا کئے ہیں۔ جو معاشرہ خود ان قوانین کا پابند رہتا ہے اور دوسرے انسانوں سے اس کی پابندی کراتا ہے ہم اُسے اسلامی ریاست کہتے ہیں۔ اس میں خدا کی نیابت نہیں ہوتی بلکہ اسکی اطاعت ہوتی ہے۔

چونکہ اس موضوع پر اس سے پہلے کئی مرتبہ شرح و بسط سے لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے اسکی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

(۲) قصہ آدم کے ضمن میں قرآن کریم میں ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۳۱) "خدا نے آدم کو تمام اسماء کا علم دیدیا۔ پھر انھیں ملائکہ کے سامنے رکھا اور ان سے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ان کے اسماء بتا دو۔ اس کے بعد ہے کہ فرشتوں نے اس سے اپنی معذوری ظاہر کی اور آدم نے ان کے اسماء بتا دئے

اصلاحی صاحب نے اس ضمن میں لکھا ہے

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو (جو پہلے سے اپنی ذریت کے ناموں سے واقف ہو چکے تھے) حکم دیا کہ وہ اپنی ذریت کے نام ان فرشتوں کو بتائیں۔ آدم کو فرشتوں کو اپنی ذریت کے ناموں سے آگاہ کیا اور ان کی نسل میں جو انبیاء و رسل اور مجددین و مصلحین پیدا ہونے والے تھے ان کا تعارف کرایا۔

اس تفسیر کی تائید قرآن سے نہیں ہوتی۔ اس نے کہیں بھی یہ نہیں کہا (نہ کسی مقام سے اس کا اشارہ تک ہی ملتا ہے) کہ حضرت آدم کو اس کی ذریت کے نام بتا دیے گئے تھے اور انہوں نے اپنی ذریت میں پیدا ہونے والے انبیاء و مجددین و مصلحین کا تعارف فرشتوں سے کرا دیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ قرآن میں بیان کردہ قصۂ آدم میں "آدم" سے ایک فرد (ابوالبشر) مراد لینے کا عقیدہ بھی انہی عقائد میں سے ہے جن کی طرف شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ آدم کا صحیح مفہوم، اور اس کے خلیفۃ فی الارض ہونے کا مطلب "ابلیس و آدم" میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

(۳) اس مقالہ میں دو اور بنیادی غلطیاں ہیں۔ یعنی

(i) خلافت کا وجود انسانی فطرت کا جزو ہے

(ii) خود اس کا شعور اس کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔

یہ عقیدہ کہ انسان کی ایک فطرت ہے اور یہ فطرت خود فطرت اللہ پر متفرع ہے، غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے انسان کے متعلق کہا ہے کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (۴/۲۸) انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (۲۱/۳۷) انسان عجلت پسند واقع ہوا ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا (۱۷/۱۱) انسان بڑا جلد باز ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا (۱۷/۶۷) انسان ناشکر گذار ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (۱۷/۱۰۰) انسان بڑا ہی تنگ ظرف واقع ہوا ہے۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸/۵۴) انسان بڑا ہی جھگڑالو ہے۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا (۷۰/۱۹) یقیناً انسان ایسا ہے کہ اس کا کبھی پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (۳۳/۷۲) انسان بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ہیں قرآن کی رو سے انسان کی چند خصوصیات۔ اگر انسان کی یہی فطرت ہے تو اس فطرت کو کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے تو اس سے خود خدا کی فطرت کے متعلق جو نقشہ سامنے آتا ہے اسے کسی طرح بھی خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ عقیدہ بھی غیر قرآنی ہے کہ انسان کی کوئی فطرت ہے۔ جن خصوصیات کا اوپر ذکر کیا ہے وہ انسان کی طبعی یا حیوانی زندگی کے لوازم ہیں۔ جہاں تک اس کی انسانی زندگی کا تعلق ہے اسے کچھ ممکنات عطا کی گئی ہیں جن کی نشو و نما اور نمود وحی کی روشنی میں ہوتی ہے۔ اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو وحی کی اتباع سے انسانی زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی برت کر حیوانی روش پر چلتا جائے۔ فطرت اسکی نہیں ہے۔ فطرت کبھی بدلا نہیں کرتی۔

دوسری شق (کہ اس بات کا شعور انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے) بھی غیر قرآنی ہے۔ انسان کو علم حاصل کرنے کی صلاحیت

قوتیں دی گئی ہیں۔ کسی چیز کا علم اس کے اندر نہیں رکھا گیا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نیک و بد کی تمیز کا علم انسان کے اندر رکھ دیا گیا ہے۔ اگر نیک و بد کی تمیز انسان کے اندر موجود ہوتی تو اسے انبیاء کرام کی وساطت سے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ یہ بے جلے کی تمیز حیوانوں کے اندر از خود رکھدی گئی ہے (یعنی جس حد تک انہیں اس تمیز کی ضرورت تھی) وہ اس تمیز کے مطابق زندگی بسر کئے چلے جاتے ہیں نہ انہیں خارج سے آنے والی وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ نہ ہی وہ اس روش سے ذرا ادھر ادھر ہٹتے ہیں۔

ان امور کی تفصیل "سلیم کے نام خطوط" میں ملے گی۔

(۴) حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم قرآن اور علم و بصیرت کی روشنی میں ان امور پر غور کریں تو ان کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔ نہ ہی ان میں کسی قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ پیچیدگیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب ہم اپنے ذہن میں پیدا شدہ تصورات کو دین کے مسلمات قرار دے لیں اور پھر ان کی تائید میں دلائل تلاش کرنا شروع کر دیں۔

اسلام میں

قانون سازی

کا اصول

اس میں پاکستان کے علاوہ بعض دیگر ممالک اسلامیہ کے بلند پایہ مقننین کے افکار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں قانون شریعت کا کام کس نہج پر ہونا چاہیئے۔

یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ آپ اپنا نسخہ فوراً منگا لیجئے۔

قیمت فی جلد دو روپے آٹھ آنے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی۔

مذاکرۂ عالمِ اسلامی (لاہور)

اسلام میں فرد کے حقوق

از پروفیسر مہدی علاّم (عین شمس یونیورسٹی۔ قاہرہ)

یہ مضمون اجتماعی اسلامی معاشرے کے ایک پہلو پر روشنی ڈالے گا، اور وہ پہلو یہ ہے کہ اسلامی معاشرے نے فرد کو کیا حقوق دیئے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ حقوق اپنے جلو میں کچھ ایسے فرائض کو بھی لئے ہوئے ہیں جو ان حقوق کی مطابقت سے معاشرے کے دوسرے افراد یا پوری قوم پر عاید ہوتے ہوں۔

مضمون کی ابتدا قومی زندگی کی سب سے چھوٹی وحدت سے اگر کی جائے تو غالباً یہ آسان طریق کار ہوگا۔ قومی زندگی کی سب سے چھوٹی وحدت، ایک خاندان ہوتا ہے جو قوم اور فرد کے درمیان رشتے کو استوار کرتا ہے۔

اسلام میں خاندانی زندگی کا تصور محبت، اور ہمدردی کی مستحکم بنیاد پر قائم ہے۔ یعنی میاں اور بیوی میں محبت، والدین اور اولاد میں محبت، اور پھر ان سب کا دوسرے عزیز و اقارب سے محبت و ہمدردی کا رشتہ، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام میں نوکروں ملازمین کو بھی گھر کے افراد کی حیثیت دیدی گئی ہے۔ چنانچہ اسلام گھریلو ملازموں کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے کہ گھر کے مالک جو کھانا کھائیں ملازموں کو بھی وہی کھانا ملے جیسے کپڑے مالک خود پہنیں ملازم کو بھی ویسے ہی کپڑے پہنائے جائیں۔ اور یہی نسبت رہائش کے طرز وغیرہ کے متعلق بھی کی گئی ہے۔ اس پر بس نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ گھریلو حقوق، پالتو جانوروں کا بھی احاطہ کر لیتے ہیں۔ کیونکہ پالتو جانوروں کے تحفظ اور ان کی بہبود کے سلسلہ میں اسلام نے بڑے اہم حقوق عطا کئے ہیں؟ ان حقوق کی اساس وہ رشتہ ہے جس پر اسلامی مسلمان گھرانے کی عمارت کھڑی ہے، اور اس رشتے کی تشریح قرآن پاک میں یوں کی گئی ہے

"خدائے پاک کے وجود کی ایک دلالت یہ بھی ہے کہ اس نے تم میں سے ہی تمہارے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان کے ہمراہ امن و راحت کی زندگی بسر کر سکو، اور اس نے تمہارے دلوں میں محبت اور جذبۂ ترحم کو جاگزیں کیا ہے۔" (سورۃ ۳۰۔ آیت ۲۰)

محبت اور ہمدردی کے اس سلسلہ میں اسلام نے انسان کو ان حقوق سے سرفراز فرمایا ہے۔

۱۔ ذاتی تحفظ کا حق

یہ حق ہر فرد کے لئے ہے۔ اور قوم کو یہ حق ہر فرد کو دینا چاہیئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نے اس حق کو اس قدر مقدس بنا دیا کہ اپنی جان کی حفاظت ہر فرد کے لئے فرض قرار دیدی گئی، اور اس بارے میں ارشاد

خداوندی ہے۔ "اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان فراہم نہ کرو" (۲: ۱۹۵) چنانچہ خودکشی مذہباً حرام اور گناہِ عظیم ہے۔ رسولِ مقبول کا یہ ارشاد ہے "جو شخص پہاڑی پر سے کود کر خودکشی کرتا ہے وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ اسی عمل کو دہرائے گا اور جو زہر کھائے گا وہ جہنم میں ہمیشہ زہر ہاتھ میں لئے کھاتا رہے گا۔ اور وہ شخص جو لوہے کے ڈنڈے سے اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لوہے کا ڈنڈا اپنے پیٹ میں چبھوتا رہے گا۔" یہی نہیں بلکہ خودکشی کے بارے میں فقط سوچنا یا اس کی خواہش کرنا بھی ممنوع ہے جیسا کہ رسولِ اکرمؐ کے ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے۔ "دیکھو تم میں سے کسی کو ہرگز موت کی خواہش نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ جو کوئی ایسا کرتا ہے ہو سکتا ہے وہ ایک نیک انسان ہو۔ اور زیادہ دیر تک زندہ رہ کر وہ نیکی کے کچھ اور کام کر جائے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک برا آدمی ہو۔ مگر کچھ دیر زندہ رہ کر اس کی اصلاح ہو جائے۔"

تعلیم کا حق

اسلام چونکہ ایک ایسا مذہب ہے جو روشن دماغی کو پسند کرتا ہے اور روشنی پھیلانا چاہتا ہے اس لئے نہ تو اس کا انحصار جہالت پر ہے اور نہ یہ انسانی عقل و فکر کو ماؤف کر کے اپنے پیروکاروں کی اندھی تقلید ہی کی بنا پر پھیلتا پھولتا ہے۔ چنانچہ حضرت انس ابن مالک کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ اکرمؐ کے سامنے ایک شخص کا تمسخرانہ انداز میں ذکر کیا گیا۔ اس پر آپؐ نے پوچھا، اس کی عقل کیسی ہے۔ لوگوں نے جواب دیا۔ اے خدا کے رسولؐ! وہ انتہائی عبادت گذار ہے۔ اس کا کردار نہایت اعلیٰ ہے وہ بے حد پرہیزگار ہے، وہ بڑا خوش اطوار ہے۔ اس جواب پر رسولِ کریمؐ نے اپنے اسی سوال کو دہرایا۔ اس کے جواب میں لوگوں نے کہا یا رسولؐ اللہ ہم اس کی تعریف و ستائش، اس کی عبادت گذاری اور نیک خصائل کی بنا پر کرتے ہیں لیکن آپ ہم سے اس کی عقل کے بارے میں استفسار فرماتے ہیں۔ اس پر رسولؐ اللہ نے کہا کہ ایک نادان عبادت گذار اپنی جہالت اور بے خبری کے باعث ایسے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے جو ایک برے سے برے انسان کی برائیوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں لیکن خدا کے ہاں قرب و مدارج تو لوگوں کی عقل کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔

اس نکتے کے بارے میں شاید سب سے زیادہ نمایاں دلیل وہ آیت ہے جو سب سے پہلے حضورؐ پر نازل ہوئی۔ اور جو یوں ہے، "اپنے خدا کے نام پر پڑھو جس نے کائنات کی تخلیق کی۔ جس نے انسان کو حقیر مادے سے خلق کیا، پڑھو، اور تمہارا خدا جو سب سے زیادہ لائق تقدیس ہے جس نے قلم کے ذریعے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔"

۳۔ آزادیٔ فکر کا حق

اسلام فرد کو انفرادی و شخصی فیصلے کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ چنانچہ جب قرآن مجید میں مثال کے طور پر اس آیت میں یہ ارشاد ہوتا ہے کہ "یقیناً ہم نے اولادِ آدم کو وقارِ بخشا ہے" تو اس وقار میں لازماً دو چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ یعنی ایک طرف تو یہ کہ اسے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہونا چاہیئے اور دوسری طرف یہ کہ انسان کو آزادیٔ فکر میسر ہونی چاہیئے۔ رسولِ خدا کے اس ارشاد سے اس بات کی وضاحت پوری طرح ہو جاتی ہے کہ "تم میں سے کسی کو بھی یہ کہہ کر اندھی تقلید نہیں کرنی چاہیئے کہ میں تو لوگوں کی پیروی کرنے والا ہوں۔ اگر وہ نیکی کا کام کریں گے تو میں بھی نیک کام کروں گا اور اگر بدی کی راہ اختیار کرتے ہیں تو میں بھی اسی راہ پر چلوں گا۔ تمہیں حق کی راہ پر ثابت قدمی سے چلنا چاہیئے۔ اگر لوگ نیکی کے کام کریں

تو ان کی تقلید کرو لیکن بُرے کاموں میں ان کا ساتھ نہ دو"۔ ایک اور ارشاد میں حضورؐ نے اس اصول کا بیان اس طرح کیا ہے کہ اسے انسان کے ایک حق کے درجے سے اٹھا کر اسے اس کے فرض کا رتبہ دیدیا ہے۔ فرمایا جو شخص تعصب، جھوٹے وقار اور جہالت پر مبنی جنگ لڑتا ہے، اور یوں اپنے قبیلے کے لئے غیظ و غضب کی راہ اختیار کرتا ہے اپنے قبیلے کے مقاصد کا علمبردار بنتا ہے، اور اپنے قبیلے کے نقطۂ نظر کی حمایت کرتا ہے اگر اس جنگ میں وہ کام آتا ہے تو وہ مسلمان کی موت نہیں مرے گا؛ بلکہ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ہمیں آزادانہ غور و فکر سے محروم نہیں کیا گیا۔ تاکہ ہم کہیں اسی قسم کی زنجیروں میں جکڑے نہ رہ جائیں۔ جن میں ظہورِ اسلام سے قبل کے عرب گرفتار تھے اور جو ہر صورت اپنے قبیلہ کی حمایت کرتے تھے خواہ قبیلہ حق پر ہو یا نہ ہو۔

جہاں تک انسانی فیصلے اور رائے قائم کرنے کا تعلق ہے اس میں اسلام نے ہمیشہ غلطی کو قابل معافی خیال کیا ہے۔ بشرطیکہ یہ غلطی دیانتدارانہ غور و فکر کا نتیجہ ہو، اسلام کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جو شخص اپنے اخلاقی فیصلے کو بروئے کار لاتے ہوئے (اجتہاد کرتے ہوئے) صحیح رائے قائم کرے گا تو اسے دگنا صلہ ملے گا، اور اگر وہ غلط رائے قائم کرے تو اس کا اسے ایک ہی صلہ ملے گا اور وہ اس بات کا صلہ ہوگا کہ اس نے اپنی قوت فیصلہ سے کام لیا (یعنی اجتہاد سے کام لیا)

۴۔ عورتوں کے حقوق

مسلمان عورت ہی دنیا بھر میں وہ پہلی عورت ہے جو آزادی سے ہمکنار ہوئی۔ مگر یہاں اس بات کا خیال رہے کہ میں ایسے فرقوں یا قوموں کا ذکر نہیں کر رہا جو کہنے کو تو اسلام کا نام لیوا ہیں مگر اسلام کی صحیح تعلیمات پر عمل نہیں کرتیں۔ آیئے ہم پیغمبر اسلام اور ان کے صحابہ کرامؓ کے عہد پر نظر ڈالیں۔ اس عہد میں ہمیں جنگ احد میں عورتیں وہی خدمات سرانجام دیتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں جو عہد جدید کی عورتیں ادا کرتی ہیں۔ یعنی فوجیوں کے آرام و آسائش کی نگہبانی اور زخمیوں کی مرہم پٹی جیسی خدمات۔ اس عہد میں ہی ہمیں وہ عورتیں نظر آتی ہیں جو حضرت عمرؓ سے اس وقت بحث و تمحیص کرتی دکھائی دیتی ہیں جب وہ مسجد میں مہر کی زیادتی کی تنسیخ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس خطبے کے دوران میں ایک عورت انہیں قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ کر روکتی ہے۔ "اگر تم نے اپنی بیوی کو سونے کا ڈھیر دے دیا ہو تو پھر اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو"۔ اس پر حضرت عمرؓ اس کے اعتراض کو تسلیم کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں "اس عورت نے حق بات کہی جب کہ عمر غلط بات کہہ رہا تھا"۔

چودہ سو برس پہلے اسلام نے عورت کے اقتصادی و معاشرتی حقوق کا واضح اعلان کیا۔ لیکن مغرب کی عورت اپنی مسلمان بہن سے ایک ہزار برس بعد ان سے ملتے جلتے حقوق حاصل کر پائی۔

ظہورِ اسلام سے پہلے لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی جو غیر اسلامی رسم موجود تھی۔ اسلام نے اس کا استیصال کر دیا اور عورتوں کے لئے خاندان میں قابل عزت جگہ پیدا کی اور بچوں میں ایسے امتیازی سلوک کو ممنوع قرار دیا جو لڑکوں کے حق میں ہو۔ چنانچہ رسول اکرمؐ کا یہ ارشاد ہے: "ہر وہ شخص جس کی ایک لڑکی ہو، اگر وہ اسے زندہ دفن کرنے سے اجتناب کرتا ہے، اس کے ساتھ ذلت کا برتاؤ نہیں کرتا۔ اور اس کے مفاد کے خلاف لڑکے کے حق میں جانبداری کا مظاہرہ نہیں کرتا تو اس کا مقام جنت ہوگا"۔ "بہترین مسلمان بہترین صاحب اخلاق ہوتے ہیں اور اپنی بیویوں کے بہترین خاوند ہوتے ہیں"۔ "تم میں سے بہترین وہ ہیں جو اپنی عورتوں سے بہترین سلوک روا

رکھتے ہیں اور تم میں سے اعلیٰ ترین وہ ہیں جو اپنی بیویوں سے اعلیٰ ترین برتاؤ کرتے ہیں، اور تم میں سے میں اپنی عورتوں سے سب سے بہتر سلوک کرنے والا ہوں۔" عورتوں کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لئے پیغمبر اسلام اپنی انتہائیت میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ یہ بھی فرمایا کہ "جنت ماں کے قدموں میں ہے"۔

اسلام نے مسلمان عورت کو اپنے مرحوم رشتہ داروں کی جائداد کا حصہ دار بنایا ہے اور یہ حصہ اس کی مالی ذمہ داریوں کے مطابق ہوتا ہے کیونکہ شادی سے پہلے اور اس کے بعد ہمیشہ عورت کی ضروریات کا بندوبست مرد کی طرف سے کیا جاتا ہے اور اسے اپنی روزی کمانا نہیں ہوتی، اس لئے وراثت میں اس کا حصہ مرد سے آدھا مقرر کیا گیا ہے۔ یہ ایک مناسب تقسیم ہے اور اس امر میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وراثت کے حصہ کی یہ تقسیم مغرب کے اس نظام سے ہزار گنا بہتر ہے جس کے ذریعے عورت کو اس کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا جس قدر اس کے لئے وصیت نامے میں لکھا گیا ہو۔ اور پھر انگلستان میں تو قانون نے دوسری عالمگیر جنگ سے بس کچھ ہی دیر پہلے عورت کو مرد کی ناانصافیوں کے چنگل سے بچایا ہے۔

اسلام نے مالی اور مادرانہ حیثیت کا مختلف طریقوں سے تحفظ کیا ہے۔ مثلاً ایک ایسی عورت کو جو امید سے ہو بچے کی پیدائش سے قبل قید کرنا ممنوع قرار دیا ہے۔ اسلام نے عورت کے جو حقوق عطا کئے ہیں ان میں سے ہر اور شوہر کی معاشی و معاشرتی حیثیت بھی شامل ہے۔ جو تحفے تحائف خاوند اپنی بیوی کو دے اسلام انھیں عورت کی ملکیت قرار دیتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی عورت کا سرپرست اسے کسی ایسے شخص سے شادی کرنے سے روکنے کا مجاز ہے جو اس کی اپنی سماجی حیثیت سے کمتر حیثیت رکھتا ہو۔ یہ اقدام اس حالت میں عورت کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے جب وہ اپنے سے کمتر درجے کے مرد پر فریفتہ ہو[1]۔

میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ میں غیر اسلامی نظام ہائے حیات پر نکتہ چینی کروں۔ لیکن مسلمان عورت کے حقوق پر تبصرہ کرتے ہوئے دو ایک باتوں کی جانب اشارہ کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ملکیت جائداد کا حق ہے جو مغربی عورت کو حال ہی میں ملا ہے کیونکہ ابھی کچھ دیر پہلے تک متمول مغربی خاتون کی جاگیر اور مزدور عورت کی تنخواہ دونوں ہی کو شوہر کی ملکیت سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ ۱۸۹۱ء تک تو انگریزی قانون شوہر کو بیوی کے مجروس کرنے کا حق بھی دیتا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک کسی انگریز عورت کو پارلیمنٹ کے ایکٹ کے بغیر طلاق حاصل کرنے کا حق تک نہیں تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ پورے ملک میں صرف دو عورتیں طلاق حاصل کر پائی تھیں

اسلام نے طلاق کے بارے میں ایسے وسیع اصول اختیار کئے جو عورت اور گھر دونوں کی حفاظت کرتے ہیں اور پھر ان اصولوں کی بنیادی روح کو نقصان پہنچائے بغیر ہر قوم کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے تجربے اور ضرورتوں کے مطابق ان اصولوں کو عمل میں لائے۔

---

[1] اسلام نکاح کے معاملہ میں عورت کو مجاز کل قرار دیتا ہے۔ اس کے رشتہ دار (خواہ باپ اور بھائی بھی کیوں نہ ہوں) اسے نیک و بد سمجھا سکتے ہیں لیکن اس کے نکاح کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہ فیصلہ اسے خود ہی کرنا ہوگا۔ (طلوع اسلام)

۶۔ عالم طفلی کے حقوق

اسلام کے عطا کردہ انتہائی اہم حقوق عالم طفلی کے وہ حقوق ہیں جن کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی قوانین کی تشکیل کی جاتی ہے۔ اسلام بچوں کے حقوق کو ان کی پیدائش سے پہلے تسلیم کرتا ہے رسول مقبول نے نیک اولاد کے لئے نیک ماؤں کے انتخاب کا مشورہ دیا۔ "صورتوں سے خبردار رہو" "اور اپنی اولاد کے لئے بہتر ماؤں کا انتخاب کرو"۔ اسلام پیدائش سے قبل بچے کو کسی قسم کی اذیت پہنچانا ممنوع قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاملہ عورت کو قید کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایسی عورت کو بچہ جننے کے بعد ہی سزا دی جا سکتی ہے۔ پھر بچے کے نام کے انتخاب میں بھی اس احتیاط سے کام لینا چاہیئے کہ وہ نام مستقبل میں اس کے لئے کسی قسم کی اذیت، شرم یا تشویش کا باعث نہ بنے۔ رسول کریمؐ نے کہا ہے، "والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ بچے کو تعلیم دیں۔ اس کا اچھا نام رکھیں اور شادی کی عمر میں اس کی شادی میں اس کی مدد کریں"۔

والدین کے مقابلے میں بھی اسلام بچے کا تحفظ کرتا ہے۔ اسلام بچے کو روزی کی خاطر ایسے کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو اس کے جسم، ذہن یا اخلاق کو بگاڑے۔ اس مسئلہ کے اخلاقی پہلو پر اسلام حضورؐ کے ان الفاظ میں زور دیتا ہے: "بچوں کو روزی کمانے پر مجبور نہ کرو۔ کیوں کہ اگر وہ یہ محسوس کرینگے کہ انھیں اپنی روزی کمانا ہے تو وہ چوری کرنے لگیں گے"۔ اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ ایسی کچی عمر میں بچے کا معیار اقدار اتنا پختہ نہیں ہوتا کہ وہ دولت کے حصول میں ذرائع کی پروا بھی کرے۔ چنانچہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چوری، مکر و فریب اور اسی قسم کی دوسری برائیوں کی ترغیب سے بچ نہ سکے۔

اسلام نے والدین کی طرف سے غلط رہنمائی کے خلاف بھی بچے کی حفاظت کی ہے۔ رسول مقبولؐ فرماتے ہیں۔ "والدین کی بات سننا اور حکم ماننا اسی وقت تک لازم ہے جب تک کہ وہ غلط کام کرنے کے لئے نہ کہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس قسم کے حکم پر کان دھرنا اور اسے بجا لانا دونوں غیر ضروری ہو جاتے ہیں"۔

(۶) اسلام نے ہمسائے کے جو حقوق مقرر کئے ہیں ان پر غور و فکر قابل لحاظ ہے۔ ہمسائے کے حقوق صرف اس بات تک محدود نہیں ہیں کہ اس سے اچھے ہمسائے کا سا سلوک کیا جائے بلکہ انھیں تو مسلمان کے مذہب کا جزو بنا دیا گیا۔ اسلام نے ہمسائے کو حق شفع عطا کیا ہے[1] جو ہمسائے کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے اور اسے خصوصی مراعات دیتا ہے۔

(۷) مجھے یہاں سرسری سے انداز میں ملازموں کے حقوق کا ذکر بھی کرنا ہے۔ اگرچہ اسلام نے ان کے حقوق کا ذکر اس طور پر نہیں کیا۔ اسلام نے ملازموں کے حقوق پر اس قدر زور دیا ہے کہ ان حقوق کو ان الفاظ میں ہی مختصر طور پر سمیٹا جا سکتا ہے کہ ملازموں کو وہی خوراک دی جائے اور وہی کپڑا پہنایا جائے جو خود مالک استعمال کرتے ہوں اور پھر مالک کی طرف سے ملازم کو جب بھی کوئی کام دیا جائے تو مالک کو چاہیئے کہ اس کام میں ملازم کی مدد کرے۔

(۸) گھریلو زندگی کے حقوق اس قدر جامع ہیں کہ ان میں جانور تک آجاتے ہیں۔ اسلام نے ہمارے ان بے زبان رفیقوں کی حفاظت

---

[1] یہ فقہ کا مسئلہ ہے۔ قرآن کا نہیں۔ (طلوع اسلام)

کے جو حقوق دفع کئے، ان سے ملتے جلتے اور مشابہ حقوق کے لئے مطالبہ کرنے اور غور و فکر کرنے کے لئے عصر حاضر کی انسداد بے رحمی مویشیاں ایسی انجمنوں کے وجود میں آنے کے لئے ایک ہزار سال سے بھی زائد عرصہ درکار تھا۔ ہمیں سفر کرتے وقت یہ حکم دیا جاتا ہے کہ ایسی راہ اختیار کریں جس میں چراگاہیں آتی ہوں ایسے اصطبل جہاں مویشی رات بسر کرتے ہوں۔ ان کے انتخاب میں یہ احتیاط برتی جائے کہ وہ ان کے لئے آرام دہ بھی ہوں اور جراثیم وغیرہ سے پاک بھی۔ حضورؐ نے یہ حکم دیا کہ گرمیوں میں رات کے وقت سفر کیا جائے تاکہ باربرداری کے جانور دن کی شدید گرمی میں آرام کر سکیں۔ ایک دفعہ آنحضرتؐ نے ایک عورت کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنی لڑکیوں سے کہے کہ وہ دودھ دوہنے سے پہلے ناخن تراشیں تاکہ ناخن مویشیوں کے تھنوں کو زخمی نہ کریں۔ انھوں نے ہمیں اس بات کا حکم دیا ہے کہ منڈی میں یا کسی اور جگہ کھڑے ہو کر جب ہم باتیں کرنے یا خوش گپیوں میں مصروف ہوں تو ہمیں سواری پر سے اتر جانا چاہیئے کیونکہ جانور ایسے موقعوں کے لئے کرسی یا مونڈھے کا کام دینے کے لئے نہیں ہوتے۔"

مختصر یہ کہ اسلام نے فرد کو معاشرے میں جو حقوق عطا کئے ہیں، ان کا یہ بیان بعض انتہائی اہم حقوق کا بس خاکہ ہی پیش کرتا ہے۔ ان حقوق کے سلسلہ میں دو نکتوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اول یہ کہ یہ حقوق کسی کشمکش یا جدوجہد کے نتیجے کے طور پر معرض وجود میں نہیں آئے، دوسرے یہ کسی اقتدار کی مخالفت میں بعض لوگوں کی جانب سے پیش کردہ مطالبے کے جواب میں حاصل نہیں ہوئے۔ یہ تو از راہ لطف و عنایت، خدائے عادل و رحیم کی جانب سے نازل ہوئے، اور اسلامی معاشرے کے بنیادی جزو بن کر اسلامی سماج کی بنیادی روح کی ترجمانی کرنے لگے۔ دوسرے یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلام نے ان حقوق کا نفاذ ایک ہزار سال قبل کیا، اور یہ چیز بادشاہوں اور ان کی رعایا کے درمیان کسی کشمکش کے بغیر وجود میں آئی۔ میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء)، حقوق انسانی کا اعلان نامہ (۱۶۸۹ء)۔ اور انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) تاریخ کے وہ ابواب ہیں جنھیں انسانیت کے خون سے لکھا گیا۔ اور ہزاروں لاکھوں انسانی زندگیاں ان میں تلف ہوئیں، لیکن صحت مند انسانی معاشرے کی تعمیر کے لئے اسلام نے یہ انسانی حقوق، انسان کو ایک نعمت اور عطیے کی صورت میں بخشے۔

قرآنی فیصلے

روزمرہ زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ دین کے متعلق پُر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے۔ قیمت:۔ چار روپے

اَلدِّیْنُ یُسْرٌ

(شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی مرحوم)

[طلوع اسلام بابت ستمبر ۵۷ء میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی مرحوم کا جو مقالہ شائع ہوا اسے بیحد پسند کیا گیا۔ چنانچہ اکثر احباب نے لکھا ہے کہ حالی مرحوم کے اسی قسم کے اور مقالات بھی شائع کئے جائیں۔ زیر نظر مضمون، رسالہ تہذیب الاخلاق میں ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حالی نے بتایا ہے کہ وہ دین جو خدا کی طرف سے ملا تھا، سیدھا سادہ اور آسان تھا۔ اس میں "نہ اعتقادات میں کوئی محال بات تسلیم کرائی گئی تھی نہ عبادات میں کوئی ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا جو ناقابل برداشت ہو"۔ لیکن اس کے بعد اس دین پر حاشیے چڑھائے گئے۔ اور ان عناصر کو بھی دین کا جزو بنا دیا گیا جنہیں دین سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ اس طرح یہ صاف اور سادہ دین عجیب گورکھ دھندا بن گیا۔ ان حاشیوں میں پہلا حاشیہ یہ تھا کہ نبی اکرمؐ نے جو امور محض عرب کی معاشرت کے لحاظ سے اختیار کئے تھے (مثلاً رہنے سہنے کا طریق وغیرہ) انہیں بھی ناقابل تغیر شریعت قرار دے دیا گیا۔ دوسرا حاشیہ یہ تھا کہ دین کی روح پر نگاہ رکھنے کے بجائے رسوم و آداب کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ جس کی وجہ سے یہ نظام زندگی بننے کے بجائے میکانکی طریق عمل بن کر رہ گیا۔ اس کے بعد انھوں نے چار اور حاشیوں کا ذکر کیا ہے ہم اس مضمون کی ابتدا تیسرے حاشیے سے کرتے ہیں اور حواشی اور غیر ضروری حصوں کو حذف کر کے، باقی مضمون آخیر تک شائع کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام]

وضعی حدیثیں

تیسرا حاشیہ:۔ واعظوں کی نادانی اور صوفیوں کی سادہ لوحی یا خود غرضوں کی بددیانتی سے اس پاک دین پر چڑھا۔ انھوں نے

اعمال ظاہری کی ترغیب یا کسی مذہب کی تائید یا تعصب کے جوش میں کسی دنیوی غرض کے پورا کرنے کے لئے سینکڑوں اور

ہزاروں حدیثیں وضع کیں اور رفتہ رفتہ یہ سراسر جعلی اور بناوٹی احادیث بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار پا گئیں۔ اگرچہ محققین نے ان کی تحقیقات اور چھان بین کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور ان کی موضوعات اور منکریات کو احادیث صحیحہ سے جہاں تک ہو سکا جدا کیا، مگر ان کی جرح و قدح صرف کتابوں ہی تک محدود رہی۔ اور واعظوں کے رنگین فقرے جو کم سے کم ہزار برس تک وعظ کی بھری مجلسوں میں وقتاً فوقتاً مسلمانوں پر چلتے رہے وہ مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک وبا کی طرح پھیل گئے۔

علماء کی ایک بڑی جماعت (جیسا کہ جامع الاصول اور شرح نخبۃ الفکر وغیرہ میں تصریح کی گئی ہے) اس بات پر متفق ہو گئی تھی کہ ترغیب اور ترہیب کے ذریعہ حدیثیں وضع کرنی یا ضعیف اور منکر حدیثوں کی روایت کرنی جائز ہے۔

اسی بناء پر بے شمار حدیثیں ترغیب کے لئے وضع کی گئیں۔ مثلاً مؤذنوں کے فضائل میں ایسا مبالغہ کیا گیا کہ ان کے مراتب سے بڑھ کر انسان کے لئے دلوں کا نبیاً او اماماً کوئی درجہ تصور میں نہیں آسکتا۔ مثلاً یہ حدیث کہ مؤذن کے لئے ہر شے جس کو اس کی اذان کی آواز پہنچی ہے پتھر ہو یا درخت یا ڈھیلا یا خشک یا تر قیامت کے دن سب ہی گواہی دیں گے اور اس مسجد کے تمام نمازیوں کے برابر اس کو ثواب ملے گا۔" یا یہ حدیث کہ قیامت کے دن سونے کی کرسیاں لائی جائیں گی جن میں یاقوت اور موتی جڑے ہوئے ہوں گے اور سندس اور استبرق کے فرش پر بچھائی جائیں گی۔ پھر ان پر نور کے سائبان لگائے جائیں گے اور پکارا جائے گا کہ کہاں ہیں مؤذن تاکہ ان پر آکر بیٹھیں۔" یا مثلاً مسجد کی خدمت کرنے والوں کے فضائل میں جیسے:

"جس نے مسجد میں چراغ روشن کیا جب تک وہ چراغ روشن ہے اس کے لئے فرشتے اور حاملانِ عرش برابر استغفار کرتے رہتے ہیں۔"

"جس نے مسجد میں قندیل لٹکائی یا بوریا بچھایا اس پر ستر فرشتے برابر درود بھیجتے ہیں جب تک وہ قندیل نہیں بجھتی یا وہ بوریا نہیں ٹوٹتا۔"

"جس نے خدا کے کسی گھر میں جھاڑو دی اس نے گویا چار سو حج کئے اور چار سو بردے آزاد کئے۔ چار سو روزے رکھے اور چار سو جہاد کئے۔"

یا مثلاً حفظ القرآن کے فضائل میں جیسے یہ حدیث کہ حافظِ قرآن کی فضیلت غیر حافظ پر ایسی ہے جیسے خالق کی فضیلت مخلوق پر۔ اسی طرح سینکڑوں روزے اور ہزاروں نمازیں اور بے انتہا طواف اور بے شمار صدقے وضع کئے اور ان کے اجر اور ثواب کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا۔

ترہیب و تخویف کے لئے بھی ایسے ہی مبالغے کے ساتھ حدیثیں وضع کی گئیں۔ مثلاً

"جس نے دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کیا وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا۔"

"مسجد کے ہمسائے کی نماز مسجد کے سوا کہیں نہیں ہوتی۔"

"جو شخص مسجد میں دنیا کی باتیں کرتا ہے خدا اس کے تمام اعمالِ حسنہ کو ضائع کر دیتا ہے۔"

"جس نے بے نماز کی، وہ ایک لقمے سے کی۔ اس نے گویا تمام نبیوں کے قتل میں اعانت کی"۔

بہت سی حدیثیں اپنے اپنے مذہب کی تائید اور نصرت کے لئے بنائی گئیں۔ مثلاً

"جس نے نماز میں رفع یدین کیا اس کی نماز باطل ہے"۔

"جس نے رکوع میں رفع یدین کیا اس کی نماز باطل ہے"۔

"جب سورۂ کوثر نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے جبریل سے پوچھا کہ مخرسے کیا مراد ہے۔ کہا یہ مراد ہے کہ جب نماز کی نیت باندھو تو پہلی تکبیر پر اور رکوع کرتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرو۔

بہت سی حدیثیں تعصب یا تنفر کی وجہ سے بنائی گئیں جیسے امام شافعیؒ اور امام اعظمؒ کی مدح یا ذم میں یا جیسے حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کی مدح یا ذم میں مثلاً یہ حدیثیں:

"خدا کے نزدیک تین امین ہیں۔ میں۔ جبرئیل۔ اور معاویہ"۔

"ہر امت کے لئے ایک فرعون ہے اور اس امت کا فرعون معاویہ ہے"۔

"ایک بار آنحضرتؐ نے جبرئیل سے ہاتھ ملانا چاہا۔ جبرئیل نے ہاتھ ملانے سے انکار کیا۔ آپ نے سبب پوچھا۔ کہا۔ تم نے ایک یہودی کا ہاتھ پکڑا تھا اور جو ہاتھ کافر کے ہاتھ سے مس کرے میں اس سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا"۔

"جو شخص یہودی یا نصرانی سے مصافحہ کرے اس کو اپنا ہاتھ دھونا اور وضو کر لینا چاہیئے"۔

امام ابن جوزیؒ نے لکھا ہے کہ حدیثیں وضع کرنے والوں کا ایک بہت بڑا گروہ ہے جن کے راس و رئیس وہب بن وہب اور قاضی بحتری وغیرہ تیرہ آدمی ہیں۔

انھی تیرہ آدمیوں میں سے ایک محمد بن عکاسہ کرمانی ہے جس نے محمد بن تمیم فاریابی کی شرکت میں دس ہزار حدیثوں سے زیادہ وضع کی ہیں۔

ابن جوزیؒ کہتے ہیں کہ جن کی حدیثوں میں وضع اور کذب وغیرہ کے آثار پائے جاتے ہیں وہ کئی قسم کے لوگ ہیں۔

پہلا گروہ۔ بعضے تارک دنیا ہیں جنھوں نے حدیث کی نگہداشت سے غفلت کی۔

دوسرا گروہ۔ بعضوں کی تحریریں ضائع ہو گئیں اور انھوں نے اپنی یاد کے بھروسہ پر غلط روایتیں کر دیں۔

تیسرا گروہ۔ بعضے ثقات بھی ہیں جو بڑھاپے میں آکر خرف ہو گئے۔

چوتھا گروہ۔ بعضوں نے سہو سے غلط روایت کی اور جب اپنی غلطی سے خبردار ہوئے تو ان کو صحیح روایت کرنے سے شرم آئی۔

پانچواں گروہ۔ بعضے زندیق اور ملحد ہیں جنھوں نے شریعت میں رخنہ اور خرابی ڈالنے کے لئے عمداً اور جان بوجھ کر حدیثیں وضع کیں۔ حماد بن زید نے کہا ہے کہ "زنادقہ نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں"۔ جس وقت ابن ابی العوجاء کو وضع حدیث کے جرم میں

قتل کرنے لگے تو اس نے اقرار کیا کہ میں نے تمہارے دین میں چار ہزار حدیثیں بنائی ہیں جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرایا ہے۔

چھٹا گروہ:۔ بعضے ایسے بھی تھے جو ثواب و اجر کی امید پر ترغیب و ترہیب کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے۔ گویا ان کے نزدیک شریعت ناقص تھی جس کی تکمیل کی ضرورت تھی۔

ساتواں گروہ:۔ بعضوں نے اپنے مذہب کی تائید میں جعلی احادیث بنائیں۔ چنانچہ اہل بدعت میں سے ایک شخص تائب ہوا تو اس نے کہا کہ حدیث کے لینے میں احتیاط کرو اور دیکھا کرو کہ کس شخص سے حدیث لیتے ہو۔ ہمارا مدت تک یہ حال رہا کہ جس بات کو چاہا حدیث نبوی کے پیرایہ میں بیان کر دیا۔

آٹھواں گروہ۔ بعضوں نے یہ ٹھیرالیا تھا کہ جس کا کوئی عمدہ قول ہاتھ لگے۔ اس میں اسناد اپنی طرف سے شامل کر دیجئے اور نبی تک سند کو پہنچا دیجئے۔

نواں گروہ۔ بعضوں نے سلاطین و ملوک کو خوش کرنے اور ان کا تقرب حاصل کرنے کے لئے یہ شیوہ اختیار کیا تھا۔

دسواں گروہ۔ بعضے قصہ گو اور واعظ تھے جو لوگوں کو حسن بیان پر فریفتہ کرنے کے لئے حدیثیں وضع کرتے تھے اور کتب صحاح میں اس قسم کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ انتہیٰ۔

اس کے سوا اور بھی اسباب وضع و افترا کے بیان کئے ہیں۔ من شاء فلیرجع الی الفوائد المجموعۃ لمحمد بن الشوکانی۔

تفسیریں

چوتھا حاشیہ یہ چڑھا کہ مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ہزاروں موضوع اور ضعیف و منکر حدیثیں بھر دیں۔ اور یہ قابل تفریق کام انہوں نے مختلف طریقوں سے کیا۔

صحابہ تابعین، تبع تابعین و من بعدہم کے اقوال بلا ذکر اسناد بحسب ضرورت اپنی اپنی تفسیروں کی تقویت کے لئے حدیث نبوی کے پیرائے میں نقل کر دیئے گئے۔

یہودیوں سے سنے سنائے لاانتہا جھوٹے اور بے بنیاد قصے تفسیروں میں بھر دیئے گئے۔

بہت سے مسائل اصول و فروع کے قرآن شریف کی عبارات و اشارات سے محض اپنی رائے اور قیاس کے موافق استنباط کئے گئے۔ نہ اس کی تائید کے لئے کوئی حدیث صحیح نقل کی اور نہ کسی صحابی اور تابعی کا قول لکھا۔

جن موجودات علوی و سفلی کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے ان کے حقائق کی تشریح ارسطو اور بطلیموس اور دیگر فلاسفہ یونان کے موافق کی گئی۔

متکلمین نے مخالف فرقوں کو الزام دینے اور اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے صدہا آیتوں کی تفسیریں اپنی مرضی کے موافق کیں اور آیات قرآنی کو کھینچ تان کر کہیں سے کہیں لے گئے اور یہ تمام کوڑا کرکٹ اصل دین میں داخل سمجھا گیا۔ اور وحی سماوی کی طرح واجب التسلیم خیال کیا گیا۔

شرح جامع صغیر میں علامہ ابن کمال سے نقل کیا گیا ہے کہ "تفسیر کی کتابیں موضوع حدیثوں سے بھری پڑی ہیں"۔

اسی طرح مفسرین کے قصص و اخبار کی نسبت ابوالامداد ابراہیم نے قضار الوطر حاشیہ۔ نخبۃ الفکر میں اور ملا علی قاری نے شرح الشرح نخبۃ الفکر میں اور علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں اور علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں تصریح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تمام قصے اہل کتاب کے ہاں سے لئے گئے۔ اصل یہ ہے کہ فتح شام میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کو اہل کتاب کی بہت سی کتابیں بہ قدر ایک بار شتر کے ہاتھ لگی تھیں۔ سو جو باتیں ان سے بکثرت منقول ہیں وہ صرف اخبار اور قصے بنی اسرائیل کے اور روایات اہل کتاب کی ہیں اور اسی طرح بہت سی روایتیں حضرت عبداللہ بن سلام سے بھی اسی قسم کی مروی ہیں پھر مفسرین کے دوسرے طبقہ میں مجاہد اور تیسرے طبقہ میں مقاتل بن سلیمان اور ان کے سوا اور لوگوں نے صدہا قصے اہل کتاب سے اخذ کئے ہیں۔

علم الکلام متکلمین کے تفلسف اور حکیمانہ تدقیقات سے اس پاک دین پر پانچواں حاشیہ چڑھا اور وہ بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار دیا گیا۔

خلفائے عباسیہ کے عہد میں جب مصر و شام۔ یونان اور قبرص وغیرہ سے فلسفے کی کتابیں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں اور ان کے ترجمے عربی زبان میں ہونے شروع ہوئے اور فلاسفہ کے مختلف خیالات اور ان کی مختلف رائیں جو باری تعالیٰ کی ذات اور صفات اور حاکم کی حقیقت سے علاقہ رکھتی تھیں علمائے اسلام میں شائع ہوئیں تو فلسفے کی چکنی چپڑی اور دلفریب دلیلوں کے آگے مذہب کی عظمت آہستہ آہستہ دلوں میں کم ہونے لگی۔ کیونکہ حکماء کے مقالات بظاہر موجہ اور مدلل دکھائی دیتے تھے۔ اور مذہبی تعلیمات محض حسن عقیدت یا وجدانی شہادت سے تسلیم کی گئی تھیں۔

دوسرے اہل نفاق کے شبہے آنحضرت صلعم کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے اور اسلام میں شک اور تردد کا بیج بو چکے تھے۔

پس دین کے خواہوں نے اس بات کی ضرورت دیکھی کہ فلسفہ یونانیہ کے مقابلے میں ایک دوسرا فلسفہ مرتب کیا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کی تائید فلسفی دلیلوں سے کی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ جیسا کہ انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے اس جدید فلسفہ میں صدہا مباحث ضرورت سے زیادہ بڑھائے گئے اور خوب دل کھول کر معرکہ آرائیاں کی گئیں۔ چونکہ یہ کام کسی جماعت یا کمیٹی نے مل کر نہیں کیا تھا بلکہ جدا جدا طبع آزمائیاں ہوئی تھیں اس لئے ضروری تھا کہ ان کی مایوں میں بے شمار اختلافات واقع ہوں۔ پس اس طرح دین اسلام میں بے شمار فرقے بن گئے۔ مگر علماء نے کھینچ تان کر ان لاانتہا جماعتوں کو تہتر فرقوں میں محدود کر دیا تاکہ حدیث ستفترق امتی ثلثۃ وسبعین فرقۃ کلھم فی النار الا واحدۃ کی سچائی میں کچھ فرق نہ آئے۔ اگرچہ اُن تہتر فرقوں میں سے معدودے فرقوں کے سوا (جیسے اشاعرہ یا شیعہ یا ان کی چند شاخیں) کوئی فرقہ اب دنیا میں نہیں پایا جاتا مگر صدہا اور ہزارہا کتابیں اُن کے مناظروں اور مباحثوں سے بھری ہوئی اب تک موجود ہیں اور وہ تمام علم کلام کے نام سے مشہور ہیں۔

علم کلام کی ان کتابوں میں جن مطالب کی تفصیل درج ہے ان کا جاننا اور سمجھنا اور یقین کرنا ایسا ضروری سمجھا گیا ہے کہ ان کے بغیر اسلام معتبر اور صحیح نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اشاعرہ کے ہاں جو آجکل "اہل سنت والجماعت" کے نام سے مشہور ہیں ان باتوں کا انکار کرنا کہ صفات باری تعالےٰ نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات۔ نہ لاعین نہ لاغیر۔ یا یہ کہ خدا تعالےٰ اگر تمام نیک بندوں کو ہمیشہ کے لئے دوزخ میں ڈال دے اور تمام شریروں کو ہمیشہ کے لئے جنت میں بھیجدے تو اس کی طرف حیف و میل کی نسبت نہیں ہو سکتی یا یہ کہ خلفا کی فضیلت ایک دوسرے پر خلافت کی ترتیب کے موافق ہے۔ یعنی ہر خلیفۂ سابق خلیفۂ لاحق سے افضل ہے بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبوت یا معاد کا انکار کرنا۔ اگر کوئی شخص مثلاً رویت بصری کو محال قرار دے اور حدیث نبوی جو رویت بصری پر دلالت کرتی ہے۔ اس کی تاویل کرے۔ یا حضرت علی مرتضیٰؓ کو شیخین کے برابر یا ان سے افضل سمجھے وہ فوراً جماعت اہل سنت سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور ان فرقوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کی نسبت کلھم فی النار کہا گیا ہے۔ شرح مواقف اور شرح مقاصد اور امام رازیؒ کی اکثر مبسوط کتابیں جو علم کلام میں ہیں اور صواعق محرقہ اور صواقع کابلی اور تحفہ اور منتہی الکلام اور ازالۃ الخفین اور اس قسم کی ہر کتاب اور ہر رسالہ جو علم کلام میں اشاعرہ کی تائید کے لئے لکھا گیا ہو یا لکھا جائے سب اول سے آخر تک واجب التسلیم سمجھے گئے ہیں اور جو شخص ان کے خلاف ایک لفظ بھی کہتا ہے وہ مبتدع سمجھا جاتا ہے۔

تقلید چھٹا حاشیہ تقلید بدعات اور رسوم کا ایک طویل الذیل حاشیہ ہے۔ جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے۔ یہ حاشیہ اس دین سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔

تقلید نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتب سابقہ کی طرح منسوخ کر دیا ہے۔

کتاب اللہ سوائے اس کے کسی کام کی چیز نہیں رہی۔ کہ

ذرا ذرا سے بچے اسے مکتبوں میں طوطے کی طرح پڑھیں یا

بڑے ہو کر اس کی تلاوت محض لفظی طور پر کریں یا

ختموں اور عرسوں میں اس کی چند آیتیں یا سورتیں مناقب کے ساتھ پڑھی جائیں یا اپنے مُردوں کی قبروں پر اس کا ایک آدھ ختم کرایا جائے۔ یا

رمضان کی تراویح میں اُلٹا اکتا کر اور چھپا چھپا کر اس کا ایک ختم وہ لوگ سنیں جو اس کا ایک حرف نہیں سمجھتے۔

سنت رسول اللہ کا بھی یہی حال ہے کہ اول تو اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے والے روز بروز صفحۂ ہستی سے محو ہوتے جاتے ہیں اور اگر چند نفوس متبرکہ باقی ہیں اُن کا لے دے کے یہ کام ہے کہ صحاح کے اول و آخر کے چند صفحے تبرکاً و تیمناً شاگرد کو سرسری طور پر پڑھا دئیے اور اس کو علم حدیث کی سند لکھ دی۔ شاگرد اور استاد دونوں کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی ضرورت کے وقت ہم کو ان حدیثوں سے کچھ کام پڑے گا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کوئی فتویٰ اور کسی مسئلے کا جواب اس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتا جب تک قاضی خان اور عالمگیری یا بحرالرائق وغیرہ کی عبارت اس میں درج نہ کی جائے۔ گویا قرآن اور حدیث کے مطالب صحیح تمام امت میں چند آدمی نہیے

جو ان کا لب لباب تھا وہ نکال کر کتب فقہیہ میں درج کر گئے۔ اب کتاب و سنت معاذ اللہ بالکل اس شعر کے مصداق ہیں۔

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیش سگاں انداختم

رسوم و بدعات کا بھی یہی حال ہے کہ وہ بھی اسلام کی رگ و پے میں بیٹھ گئی ہیں ان کا دین سے جدا کرنا اور گوشت کا ناخن سے جدا کرنا برابر ہے۔ دو پلڑی ٹوپی۔ پردہ دار انگرکھا۔ ڈھیلا یا تنگ مہری کا پاجامہ۔ نوکدار جوتی۔ زمین پر بیٹھ کر کھانا اور اسی قسم کی سینکڑوں باتیں مسلمانوں نے قطعاً غیر قوموں سے سیکھی ہیں۔ بیاہ شادی کی اکثر رسوم ہندوستان میں آکر انھوں نے تعلیم پائی ہیں مگر وہ اس قدر عزیز اور ضروری ہو گئی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کے خلاف کرتا یا کہتا ہے تو وہ کرشان کا خطاب پاتا ہے۔

یہاں ہم کو رسوم و بدعات کا مفصل بیان کرنا منظور نہیں ہے بلکہ مجمل طور پر صرف یہ جتانا ہے کہ دین اسلام پر جو فضول اور لغو حواشی چڑھے ہوئے ہیں ان میں سے سب سے بڑا حاشیہ تقلید اور رسوم و بدعات کا ہے۔ موقع اور فرصت ہوئی تو کسی دوسرے وقت یہ بحث کسی قدر تفصیل سے لکھی جائے گی۔

یہ تمام حواشی جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ان کے سوا اور بھی بہت سے حاشیے اس سیدھے سادے دین پر چڑھے ہوئے ہیں جو تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں پس نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے علماء نے دین متین اسلام کو اس ناگوار بوجھ سے ہلکا کرنے میں کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی عظمت اور بزرگی اسی میں جانتے ہیں کہ وہ روز بروز اور بھی زیادہ بوجھل اور گرانبار ہوتا چلا جائے شاید پچھلی صدیوں میں کوئی زمانہ ایسا بھی گذرا ہو جس میں امت کیلئے شریعت کا دائرہ تنگ کرنا قرین مصلحت سمجھا گیا ہو اور انسان کے حق میں خدا اور رسول کی تکلیفیں ناکافی خیال کی گئی ہوں اور اسکی بہبودی اسی میں تصور کی گئی ہو کہ وہ کسی حالت میں اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھے مگر ہم بتحکم کہتے ہیں کہ یہ زمانہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

آج ہم کو نہ صرف دنیوی عزت حاصل کرنے کے لئے بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ دین محمدیؐ کی شان و شوکت دنیا میں قائم ہے اور امت محمدیہ اپنے ہمعصروں کی نظر میں حد سے زیادہ حقیر و ذلیل نہ ہو جائے۔ اس قدر کام درپیش ہیں کہ خالص دین کے سوا دیگر تکلفات کا تحمل ہم میں باقی نہیں ہے۔ اسلام پر حاشیے چڑھتے چڑھتے جو صورت اب اسکی ہو گئی ہے اگر اسی کو اسلام سمجھا جائے تو عنقریب کسی مسلمان کو ضروریات دین سے اس قدر مہلت نہ ملیگی کہ وہ نہایت ذلت و خواری سے دونوں وقت قوت لایموت بہم پہنچا کر بری بھلی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر لے چہ جائیکہ وہ دنیا میں عزت سے رہ سکے یا دین کی کچھ شان و شوکت بڑھا سکے جس عالم میں ہم کو اب اور آئندہ رہنا ہے۔ اس میں ادنیٰ درجے کی عزت کیساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے وہ تدبیریں درکار ہیں جو پہلے شاید ملک اور سلطنت ہی کے لئے درکار تھیں کیونکہ ترقی انسان کا زمانہ اس قوم کے حق میں سخت مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے جو اس زمانہ کا ساتھ نہ دے بلکہ اس کے برخلاف اپنے لئے الگ دوسرا راستہ اختیار کرے۔

خالص اسلام

ہم کو دین کی شان و شوکت قائم رکھنے کے لئے بھی ضرور ہے کہ صرف خالص اسلام کی حمایت کریں اور

اسکو حشو و زوائد سے پاک کرکے تمام عالم کو دکھادیں کہ صرف اسلام ہی دنیا میں ایسا دین ہے جو انسان کی خوشی اور آزادی کو ترقی دینے والا ہے۔

یورپ کے بڑے بڑے محققوں نے جو اسلام کی نسبت نہایت عمدہ عمدہ رائیں لکھی ہیں اُس سے اُن کی کمال تحقیق اور تنقیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ انھوں نے جیسا کہ اُن تصنیفات سے ظاہر ہے اس سارے مجموعہ کو اسلام نہیں سمجھا جس پر اب اسلام کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ بلکہ انھوں نے اپنی نہایت گہری نگاہ سے اس تمام کوڑے کرکٹ کو دور کرکے ٹھیٹ اسلام کا کھوج لگایا ہے اور صرف اسی پر اپنی اپنی رائیں لکھی ہیں۔ اگر وہ اس تمام مجموعہ کو جس کو ہمارے بھائی مسلمان اسلام سمجھتے ہیں ٹھیٹ اسلام جان کر اسی پر رائے لکھ بیٹھتے تو ان کی راستی اور انصاف ہرگز ایسی رائیں لکھنے کی اجازت نہ دیتا۔ جو مسلمان اس زمانے کے موافق تعلیم پا رہے ہیں یا آئندہ پائیں گے وہ جب ہی تک اسلام پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں کہ اس تمام مجموعہ کو اسلام نہ سمجھیں۔ اگر بدنصیبی سے انھوں نے بھی اسی کو دین اسلام سمجھا تو عیاذاً باللہ ان غریبوں کی نوبت الحاد و ارتداد تک پہنچ جائے گی اور اس کا مظلمہ ان مولویوں اور عالموں کی گردن پر ہوگا جو اسی ہیبت ناک ڈراؤنی اور وحشت انگیز صورت پر اسلام کا رہنا پسند کرتے ہیں۔

ہم جو دنیا کے تمام ادیان اور ملل میں سے صرف دین اسلام ہی کو واجب التسلیم سمجھتے ہیں اور اس کے سوا اور دینوں کو ایسا نہیں جانتے اسکے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ صرف اسلام ہی خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور باقی ایسے نہیں ہیں۔ کیونکہ کلام الٰہی میں وارد ہوا ہے کہ ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر۔ یعنی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نبی نہ گذرا ہو۔ اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ منھم من لم نقصص علیک یعنی ہم نے بعض انبیاء کا حال تجھ پر (اے نبی آخر الزماں) ظاہر نہیں کیا۔

پس معلوم ہوا کہ ہم اسلام کو اس وجہ سے کہ جو اوپر مذکور ہوئی اور دینوں پر ترجیح نہیں دیتے بلکہ اس سبب سے دیتے ہیں کہ جس وقت دین اسلام کا ظہور ہوا اس وقت ادیان سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہا تھا اور انسان کی افراط و تفریط سے حق اور باطل مل جل کر ایک ہو گئے تھے۔ شرک و بدعت نے توحید اور سنن راشدہ کو دبا لیا تھا اور خود غرض عالموں کی تحریفات اور مقلد جاہلوں کی جہالت اور متعصب دین داروں کے غلو سے تمام شریعتوں کے موضوع بدل گئے تھے۔

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے آن کر حق کو باطل سے جدا کیا اور جو کھوٹ اور ملاوٹ اگلی شریعتوں میں مل گیا تھا اس کو دور کرکے ایک خالص کندن نکالا اور اسی کا نام اسلام رکھا۔

اب اگر اسلام بھی شرائع سابقہ کی طرح اپنی اصلیت پر باقی نہ رہے تو ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا دین حق ہے اور باقی ادیان ایسے نہیں ہیں۔ فقط

---x---

رابطہ باہمی

تاکیدی ہدایات

بزمہائے طلوع اسلام کی اصولی ہدایات میں چند ایک امور ایسے ہیں جنہیں اچھی طرح سمجھ لینا اور بار بار سامنے لانا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً شق ۱۰ میں کہا گیا ہے۔

> بزم طلوع اسلام نہ کوئی سیاسی پارٹی ہے نہ مذہبی فرقہ۔ یہ ایک اجتماعی اور تنظیمی کوشش ہے اُس قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے جسے ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔

"سیاسی پارٹی اور مذہبی فرقہ" اور "قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے منظم کوشش" کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ سیاسی پارٹی ایک خاص سیاسی مقصد کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اس کا استحکام پارٹی کی عصبیت اور پارٹی سے باہر کے افراد سے مخالفت کے جذبات سے ترکیب پاتا ہے۔ اس کے ہر رکن کا فریضہ اپنی پارٹی کے افراد کی حمایت ہوتا ہے خواہ وہ حق پر ہوں یا نہ ہوں طلوع اسلام کی کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کسی پارٹی کا مخالف یا طرفدار ہے۔ یہ ملک کی سیاست اور مختلف پارٹیوں کے مقاصد و مسالک

نہ پارٹی نہ فرقہ

کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیتا ہے جس بات کو قرآن کے مطابق دیکھتا ہے اس کی تائید کرتا ہے (خواہ وہ کسی پارٹی کی طرف سے آئے) اور جسے قرآن کے خلاف پاتا ہے اس کی مخالفت کرتا ہے (خواہ اُسے کوئی پیش کرے)۔

ہر مذہبی فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور باقی سب کو جہنمی سمجھتا ہے۔ اس کے خاص عقائد ہوتے ہیں اور مذہبی رسوم و عبادات کو ایک خاص طریقہ سے ادا کرتا ہے۔ طلوع اسلام کا تعلق کسی فرقہ سے نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے (فرقہ سازی قرآن کی رو سے شرک ہے)۔ یہ ہر فرقہ کے عقائد و مسالک کو قرآن کی روشنی میں پرکھتا ہے جسے قرآن کے مطابق پاتا ہے اس کی تائید کرتا ہے جسے قرآن کے خلاف دیکھتا ہے اس کی مخالفت کرتا ہے۔ نماز، روزہ وغیرہ (ارکان اسلام) کے متعلق اس کا مسلک یہ ہے کہ جب تک اسلامی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں نہیں آتا، جو فرقہ جس طریق سے انہیں ادا کرتا ہے وہ اسی طریق سے ادا کرتا ہے اور کوئی کسی دوسرے سے تعرض نہ کرے۔

قرآنی فکر

"طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت" سے مقصود یہ ہے کہ اس نظام کی تشکیل کے لئے زمین ہموار اور فضا سازگار بنائی جائے جسے قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں محمد رسول اللہ والذین

معہ (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) نے قائم کیا تھا اور جس میں نہ مذہبی پیشوائیت کا کوئی دخل تھا نہ معاشی اجارہ داری کا کوئی واسطہ۔

طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ فکر کی نشر و اشاعت انفرادی طور پر ہوتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن اس سے گہری دلچسپی لینے والے کچھ احباب غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر یہی انفرادی کوششیں نظم اور قاعدہ کے ماتحت اجتماعی طور پر کی جائیں تو ان سے تھوڑے وقت میں بہت زیادہ مفید نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ ان احباب کے اس مقصد کے لئے مل بیٹھنے کا نام ہے "بزم طلوع اسلام" لہٰذا اس بنیادی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ان بزموں کا مقصد، اس قرآنی فکر کی منظم طور پر نشر و اشاعت ہے اور بس۔

ایک سوال بعض احباب کہتے ہیں کہ ہم اپنی کوششوں کو اس فکر کی نشر و اشاعت تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس سے زیادہ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں ان کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں بڑے شوق سے کیجئے۔ لیکن بزم طلوع اسلام کی طرف سے نہیں۔ سردست بزم طلوع اسلام کا دائرہ عمل وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس سے باہر نکلنا اس کے مقصد کے حدود سے تجاوز ہوگا۔ آپ حضرات جو کچھ (بزم طلوع اسلام سے الگ ہٹ کر) کریں گے وہ اگر قرآن کے مطابق ہوگا تو اسے ہماری تائید حاصل ہوگی۔

ان میں سے بعض حضرات کا کہنا ہے کہ ہم بزم کے قواعد و ضوابط ہی کو کیوں نہ بدل لیں۔ اور اپنے پیش نظر مقاصد کو بزم کے مقاصد کے دائرہ میں شامل کر لیں؟ ان سے گذارش ہے کہ بزموں کا وجود صرف اس مقصد کے لئے عمل میں لایا گیا ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے جو بزم اس دائرہ کے اندر رہتی ہے وہ بزم طلوع اسلام کہلاتی ہے۔ جو اس دائرہ کو وسیع کرنا چاہتا ہے اُسے اس کا حق حاصل ہے لیکن اس صورت میں وہ بزم طلوع اسلام نہیں کہلا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ بزموں سے متعلق اصولی ہدایات میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ

> ہر وہ مسلمان جو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر سے متفق ہو اور ان ہدایات کو تسلیم کرے، بزم متعلقہ کی منظوری سے اس کا ممبر بن سکتا ہے۔

اور یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ

> کوئی رکن یا بزم کوئی ایسی بات نہیں کرے گی جس میں فرد سازی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے جس سے طلوع اسلام کے مقصد و مسلک کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو۔ ایسی صورت میں ادارہ کو حق حاصل ہوگا کہ وہ رکن کو رکنیت سے خارج کر دے اور اس بزم کی منظوری کو واپس لے لے۔

یہ اس لئے کہ طلوع اسلام کی تحریک ایک ایسی فکری تحریک ہے جو باقی تحریکوں سے یکسر مختلف ہے۔ اس تحریک کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس کی طرف سے پیش کردہ فکر کو اچھی طرح سے سمجھا جائے اور سمجھنے کے بعد اسے دوسروں تک اس طرح پہنچایا جائے کہ انہیں اس کی متعلق کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ یہ مرحلہ بڑا مشکل اور نازک ہے۔ اس قسم کی تحریک کو اس کے ایک ہزار مخالفین اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ جتنا نقصان وہ ایک فرد پہنچا سکتا ہے جس کا شمار اس کے موافقین کی صف میں ہو لیکن وہ اس کی

فکر کو بلاکم وکاست دوسروں تک نہ پہنچا سکے یا نہ پہنچائے یا اپنے کسی قول یا عمل سے ایسا اثر یا نتیجہ پیدا کرے جو اس فکر کے خلاف ہو۔

طلوع اسلام کے پاس کوئی ایسی قوت نہیں جس سے وہ ایسے لوگوں کو اس قسم کے نقصان رساں اقدامات سے روک سکے۔ لیکن اسے اتنا تو کرنا چاہیئے کہ وہ ان لوگوں کے متعلق فیصلہ کر دے کہ وہ اس کی تحریک سے وابستہ نہیں ہیں اگر وہ اتنا بھی نہیں کرتا تو دیدہ و دانستہ قرآنی فکر کی اس تحریک کے لئے سامانِ ہلاکت پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی فکری تحریک یہ (RISK) نہیں لے سکتی کہ ان لوگوں کے ذریعے جو اس تحریک کے ساتھ منسلک سمجھے جائیں اس فکر و تحریک کے متعلق غلط باتیں پھیلیں۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے اس نے اصولی ہدایات میں مندرجہ بالا شق رکھی ہے۔

جو حضرات اس تحریک کے ساتھ اخلاص و دیانت کے ساتھ منسلک ہیں ان سے باادب گذارش ہے وہ اپنی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سمجھیں اور ان کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو اس فکر و تحریک کے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی ہونے کا موجب بنے۔ اس باب میں آپ کی احتیاط تحریک کو بہت سے نقصانات سے بچالے گی۔ یاد رکھیئے! ادارۂ طلوع اسلام آپ حضرات (یا کسی اور) سے کسی قسم کا اجر نہیں مانگتا۔ اس کا اجر یہی ہے کہ آپ اس تحریک کے لئے نقصان کا موجب نہ بنیں۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔

(ادارۂ طلوع اسلام)

منظور شدہ بزمیں

منظور شدہ بزموں کی فہرست میں حسب ذیل کا اضافہ کر لیا جائے۔

ابتدائی بزمیں	نمائندہ
(۱) موضع نواں کلی تحصیل صوابی۔ ضلع مردان	سید سخاوت شاہ باچہ صاحب
(۲) ہنگو	قاضی سلیم اللہ صاحب
(۳) ڈیرہ غازی خاں	خیر محمد صاحب کیف
(۴) سید حسین براستہ دینا۔ ضلع جہلم	مسعود احمد خاں صاحب
(۵) چنیوٹ (ضلع جھنگ)	نور محمد صاحب
(۶) شورکوٹ (")	حکیم محمد رمضان صاحب
(۷) چک ۲۲۸ (")	مستری غلام محمد صاحب
(۸) کلری (")	محمد خاں خالد صاحب
(۹) جھنگ (")	ظفر عباس قریشی صاحب

ضلعی بزمیں	ترجمان
(۱) جھنگ	شیخ سلطان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل

(۲) ڈیرہ غازی خاں ——— مشتاق احمد چغتائی صاحب

روئداد

بزم ڈیرہ غازی خاں | دارالمطالعہ کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ سلجھے ہوئے دماغ کشاں کشاں قرآنی فکر کو بلند کرنے کے لئے جمع ہو رہے ہیں۔ اراکین کی فہرست میں اضافہ ہو رہا ہے۔

لائلپور | پرویز صاحب کے مختصر سے دورے سے فضا بڑی سازگار ہو رہی ہے۔ اراکین بڑی دلجمعی سے کام کرتے ہیں۔ دفتر کا پتہ اب یہ ہے۔

ایم محمد اشرف۔ ماڈرن سینیٹری میٹریل کمپنی۔ لائل پور

پنج کسی۔ براستہ کبیر والہ | متفقین میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اجتماعات میں مختلف پمفلٹ پڑھ کر سنائے اور سمجھائے گئے۔

شیخوپورہ | بزم کے اجتماع میں مرزا غلام حیدر صاحب نے اپنے بلیغ انداز میں قرآن کریم کا درس دیا۔ فضا میں اثر پیدا ہو رہا ہے۔

لاڑکانہ | غلام محمود صاحب لاڑکانہ سے اطلاع دیتے ہیں کہ ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ "فرقے کیسے بنتے ہیں؟" کا سندھی زبان میں ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ان کا پتہ حسب ذیل ہے۔

معرفت فتح خاں صاحب۔ بان رسی فروش۔ صدیق بازار۔ لاڑکانہ

جھنگ | پرویز صاحب کے دورے کے نتائج بڑے شاندار رہے۔ جھنگ کے عوام قرآنی فکر سے کافی حد تک متاثر ہو چکے ہیں۔ بزم کی طرف سے مقامی گورنمنٹ کالج اور شہاب میونسپل لائبریری کے نام رسالہ (بلاقیمت) جاری کیا گیا ہے۔ بزم کے اپنے دارالمطالعہ سے کافی تعداد میں لوگ مستفید ہوتے ہیں اور لٹریچر کے مطالعہ سے قرآنی فکر کے بہت قریب آرہے ہیں۔

نوادرات

از:- علامہ اسلم جیراجپوری

علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ بڑا سائز ۴۰۰ صفحات قیمت چار روپے

پیشکش برائے طباعت لغات القرآن

کئی ایک احباب کی طرف سے استفسارات موصول ہوئے ہیں کہ لغات القرآن کی طباعت کا کام کس مرحلہ میں ہے۔ اس ضمن میں سردست اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ پچھلے دنوں لاہور کے مشہور چھاپہ خانوں سے طباعت کا تخمینہ لیا گیا۔ فوٹو آفسیٹ طریق سے طباعت (یعنی صرف چھپائی) کے خرچ کا۔ سب سے کم تخمینہ پینتیس ہزار روپے کا تھا۔ کتابت۔ کاغذ۔ جلد بندی وغیرہ کے اخراجات اس سے الگ ہیں۔ اگر یہ اخراجات بھی شامل کر لئے جائیں تو خرچ کا اندازہ نوے ہزار روپے سے اوپر پہنچ جاتا ہے۔ اس پر بعض تجربہ کار دوستوں نے مشورہ دیا کہ اس طریق طباعت کے بجائے دوسرے طریقوں سے طباعت کا اندازہ بھی کر لینا چاہیئے۔ نیز اس بات کو بھی سوچ لینا چاہیئے کہ اگر اتنے میں اپنا پریس لگ جائے تو یہ صورت کیسی رہیگی۔ اس وقت ان تمام امور کے متعلق مختلف حضرات تحقیق کر رہے ہیں کوشش ہے کہ یہ مراحل جلد از جلد طے ہو جائیں۔

چونکہ لغات القرآن (اور مفہوم القرآن) کی طباعت کے سلسلہ میں اکثر بزموں کی طرف سے اور بعض احباب کی طرف سے انفرادی طور پر عطیات موصول ہو رہے ہیں۔ اس لئے اس ضمن میں چند امور کا اعلان ضروری سمجھا جاتا ہے۔

(۱) یہ تمام رقوم (جن کا اعلان طلوع اسلام میں ہو چکا ہے یا اس کے بعد ہوتا رہیگا) ہمارے پاس بطور امانت جمع رہیں گی۔

(۲) جب تک اس بات کا اطمینان نہیں ہو جائے گا کہ ان کتابوں کے چھپ جانے کا خاطر خواہ انتظام ہو گیا ہے اس روپے کو صرف نہیں کیا جائے گا اور اسے جب بھی صرف کیا جائے گا اسی مقصد کیلئے صرف کیا جائے گا۔ ادارہ طلوع اسلام کے کسی اور کام میں خرچ نہیں کیا جائے گا۔

(۳) احباب سے ہمیں زیادہ ہمیں اس بات کی فکر ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت جلد از جلد ہو جائے۔ اس سلسلہ میں یہ بات واضح ہے کہ جن رقوم کے وعدے کئے گئے تھے وہ جس قدر جلد پورے کر دیئے جائیں، اس پروگرام کی تکمیل میں اتنی ہی جلدی ہو جائے گی۔

حسب معمول فہرست عطیات (موعودہ اور ایفا شدہ) پیش خدمت ہے۔

منجانب بزمہائے طلوع اسلام

پیش کنندہ	مقام	وعدہ	رقم موصولہ سابقہ روپے	رقم موصولہ ۲۰ فروری ۵۸ء تا ۲۰ مارچ ۵۸ء روپے
جناب محمد اسلم صاحب	قصور	۱۰۰	۵۰	۵۰

پیش کنندہ	مقام	وعدہ	سابقہ روپے	۲۰ فروری ۵۸ء تا ۲۰ مارچ ۵۸ء
جناب سراج الدین صاحب	قادر آباد	۱۰۰	-	-
جناب عبدالغفور محسن صاحب	کوئٹہ	۱۵۰	-	-

پیش کنندہ مقام	وعدہ	سابقہ	تا ۲۸ فروری ۵۸ء
جناب حافظ شاہ حسین صاحب منڈی محمد علی	۲۰۰	-	-
جناب نہال خاں صاحب جام پور	۲۰۰	-	-
جناب غلام جیلانی صاحب شیخوپورہ	۲۰۰	۶۰	۴۰
جناب عبدالجلیل صاحب ام سعید قطر	۹۰۰	-	-
جناب محمد رفیق صاحب قاضیاں	۳۰۰	-	-
جناب مشتاق احمد صاحب ڈیرہ غازیخاں	۲۵۰	-	۵۰
جناب گلزار حسین صاحب لائلپور	۵۰۰	-	-
جناب عبدالحکیم صاحب مردان	۱۰۰۰	-	-
جناب نصراللہ خاں صاحب سرگودھا	۵۰۰	-	-
جناب ظفر عباس صاحب جھنگ	۵۰۰	-	-
جناب مرزا علی احمد صاحب پشاور	۲۰۰۰	-	۵۳۰
جناب غلام ربانی صاحب ٹیکسلا	۵۰	-	-
جناب بخت جمال خاں صاحب سیالکوٹ	۵۰۰۰	۱۰۰۰	۵۰۰

پیش کنندہ مقام	وعدہ	سابقہ	تا ۲۸ فروری ۵۸ء
جناب عدالت حسین صاحب ایبٹ آباد	۲۰۰	-	-
جناب محمد اختر صاحب داہ چھانی	۶۷۵	۱۷۵	-
جناب محمد گل صاحب ننکانہ	۳۰۰	۷۵	۲۵
جناب عطا محمد صاحب پنج کسی	۲۰۰	۱۸۰	-
جناب مسعود احمد صاحب (ایڈیشن جہلم)	۷۰	۵۰	۲۰
جناب زبیر عزیز صاحب اوکاڑہ	۱۰۰۰	-	-
جناب محمد اسمٰعیل صاحب گوجرانوالہ	۲۰۰	-	-
جناب عبداللطیف نظامی صاحب لاہور	۵۰۰۰	۳۸۰	-
جناب محمد اکبر صاحب دیونہ منڈی	۲۰۰	۵۰	-
	۱۹,۷۹۵	۲۰۲۰	۱۲۱۵
کلیۃً ایفا شدہ وعدے	۸,۰۱۱	۸۰۱۱	
میزان (بزم)	۲۷,۸۰۶	۱۱۲۴۶	

انفرادی پیشکش

رقم موصولہ

پیش کنندہ مقام	وعدہ	سابقہ	تا ۲۸ فروری ۵۸ء
	روپے	روپے	
جناب دشمن خاں صاحب کراچی	۲۰۰۰	-	-
جناب ڈاکٹر رضا محمد خاں صاحب مردان	۵۰۰	-	-
جناب ابو الاثر حفیظ جالندھری صاحب منجانب ادارہ	۱۰۰۰	-	-
جناب فضل کریم صاحب مردان	۱۰۰	-	-
جناب خواجہ رسول صاحب پنڈدادنخاں	۱۰۰	-	-
جناب پیر تجمل حسین صاحب جھنگ	۱۰۰۰	(معتمد کے فیصلہ پر)	

پیش کنندہ مقام	وعدہ	سابقہ	تا ۲۸ فروری ۵۸ء
جناب عبدالعزیز صاحب داہران	(۱۰۰)	-	۱۰۰
جناب گمنام صاحب کراچی	(۲۵)	-	۲۵
جناب نور خاں صاحب پنڈی کیمپ	(۲۰)	-	۲۰
جناب اسد حمید صاحب کراچی	(۱۰۰)	-	۱۰۰
	۴,۹۴۵	-	۲۴۵
(انفرادی) کلیۃً ایفا شدہ وعدے	۷,۶۰۷/۸	۷,۶۰۷/۸	
(انفرادی) میزان	۱۲,۵۵۲/۸	۷,۸۵۲/۸	
میزان کل	۴۰,۳۵۸/۸	۱۹,۰۹۸/۸	

بابُ المراسلات

عورت پر ظلم کی انتہا

یہ ہے عنوان اُس خط کا جو ایک "طاہرہ بیٹی" نے ہمیں لکھا ہے اور جس کا جواب طلوعِ اسلام کی دساطت سے مانگا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس کی داستان یہ ہے کہ وہ ایک یتیم لڑکی ہے جس کی پرورش اس کے چچا نے کی ہے۔ اس کا باپ کچھ جائداد چھوڑ کر مرا تھا جس کی یہ واحد مالک ہے۔ باپ نے مرنے سے پہلے اسکی نسبت ایک لڑکے سے کر دی تھی۔ اب لڑکی (غالباً) بالغ ہو چکی ہے اور چاہتی ہے کہ اپنی شادی اپنے منگیتر سے کرے اس کے چچا کی خواہش ہے کہ وہ اس کی شادی اپنے لڑکے سے کر دے تاکہ جائداد گھر میں رہے۔ لڑکی اسے پسند نہیں کرتی۔

ان کوائف کے بعد اس نے اپنے خط میں لکھا ہے:۔

> میں اسلام کی پوزیشن سے حیران ہوں کہ وہ ایک طرف رشتہ کے انتخاب میں خوبیوں کو ترجیح دیتا ہے اور دوسری طرف وراثت کا پلندہ بھی ساتھ رکھ دیتا ہے۔ میں اپنی آپ بیتی کے پیشِ نظر کہتی ہوں کہ جب تک اسلام میں وراثت کا سلسلہ قائم ہے شادی کی فطری آزادی کسی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ وراثت کی اس بندش سے طفیل مجھ جیسی کتنی لڑکیوں کو خاندان کے غیر معیاری لڑکوں کے ساتھ رہنا پڑا ہوگا۔ وراثت کا یہ سلسلہ قرآنی ہے یا غیر قرآنی۔ اگر یہ سلسلہ قرآنی ہے تو قرآن نے بھی انسان کی فطری آزادی کو ملحوظ نہیں رکھا۔ قرآن نے فقط یہ کیا کہ قفس میں دو چار پھول لگا دیئے اور بس!

ہمارا خیال ہے کہ جو کچھ یہ عزیزہ کہنا چاہتی ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ اسے باپ کے ترکہ سے کچھ جائداد ملی ہے اور اس جائداد پر اسکے چچا کی نگاہ ہے اس لئے وہ اس رشتے پر مجبور کی جا رہی ہے جو اسے پسند نہیں۔ اگر یہ جائداد نہ ہوتی تو چچا اسے مجبور نہ کرتا۔

اگر صورت یہی ہے تو اس میں اصل خرابی اس لڑکی کے چچا کی نیت کی ہے۔ قانونِ وراثت کی نہیں۔ بہرحال جہاں تک قانونِ وراثت کا تعلق ہے یہ حقیقت ہے کہ ہمارا مروجہ قانون، قرآن کے مطابق نہیں۔ قرآن کی رو سے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ملکیت کو اپنی زندگی میں جیسے چاہے دیدے اور مرنے کے بعد اس کے متعلق جو وصیت چاہے کر دے۔ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

لیکن زیرِ نظر استفسار میں، قانونِ وراثت سے کہیں زیادہ قانونِ نکاح کا تعلق ہے۔ قرآن کی رو سے نابالغ لڑکی کا

نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ اور بالغ لڑکی اپنے نکاح کے معاملہ میں خود مختار ہے کہ جہاں اس کا جی چاہے اپنی شادی کرلے زبردستی کا نکاح، قرآن کی رو سے نکاح ہی نہیں ہوتا۔

ہمیں یقین ہے کہ اس مختصر سی تشریح سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ قرآن نے اس معاملہ میں پوری پوری آزادی دی ہے۔ یہ نادرا پابندیاں جس قدر ہیں ہمارے (غلط) قانون اور رسوم و رواج کی ہیں۔ قرآن ان کا ذمہ دار نہیں۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے درد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

حقائق و عبر

روحانی طاقت (مولانا) حسین احمد مدنی کے انتقال پر ان کی زندگی اور خصوصیات کے متعلق بے شمار مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں دو باتیں ایسی نظر سے گذریں جن کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پہلی چیز دہلی سے شائع ہونیوالے رسالہ برہان کی دسمبر ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں چھپی ہے۔

> سلوک و معرفت میں یہ حال تھا کہ لاکھوں مسلمانوں نے تجلیۂ باطنی کا فیض حاصل کیا اور روحانی مقامات طے کئے۔ مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ نے ایک مرتبہ عالم جذب میں مولوی ظہیر الحسن ایم۔اے کاندھلویؒ مرحوم سے خود ان کے مکان پر فرمایا۔ میاں ظہیر! لوگوں نے مولانا حسین احمد کو پہچانا نہیں۔ خدا کی قسم ان کی روحانی طاقت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اگر وہ اس طاقت سے کام لے کر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہیں تو نکال سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ عالم اسباب ہے اس لئے ان کو ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے اور اس غرض کے لئے ان کو وہی طریقے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو اس دنیا میں برتے جاتے ہیں۔

یہ باز ہم جیسے عامیوں کی سمجھ سے بالا ہے کہ اگر عالم اسباب میں انہی طریقوں سے کام لینا ہوتا ہے جو اس دنیا میں برتے جاتے ہیں تو پھر اس قسم کی روحانی طاقت سے فائدہ کیا ہے؟

جن طالب علم دوسری بات، اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۳ فروری ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں شائع ہوئی ہے۔

لوگ آج کل جنات کے سخر کرنے کے نئے طرح طرح کے عملیات کرتے ہیں اور مشقتیں اٹھاتے ہیں مگر کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اللہ والوں کے یہاں جنات خادمانہ حاضر ہوتے ہیں اور رشد وہدایت پاتے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلامؒ کے درس حدیث میں جنات بھی شریک ہوتے تھے۔ چند مرتبہ ایسا اتفاق ہوا ہے کہ کسی حدیث پر تقریر کرتے کرتے حضرت پشت کی جانب رخ کر کے فرماتے "آمین" گویا کسی کا سوال سن رہے ہیں۔

مولانا محمد فاروق صاحب بجنوری فرماتے ہیں کہ میرے کمرے میں محمد عمر مونگیری نام کا ایک جن رہتا تھا اس کے جن ہونے کا انکشاف اس طرح ہوا کہ ایک دن میں نے طاق میں رکھی ہوئی ماچس اس سے منگوائی تو اس نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے بہت زیادہ لمبا ہاتھ کر کے اٹھا دی میں یہ دیکھ کر ڈر گیا اور بھاگ کر حضرت شیخؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سب ماجرا کہہ سنایا۔ تب آپ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا آج اس نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ خیر گھبرانے کی کوئی بات نہیں وہ بھی تم ہی جیسا طالب علم ہے۔ اس کے بعد جب میں اپنے کمرہ میں واپس آیا تو وہ غائب تھا۔ اس کے بعد اس کو دارالعلوم میں نہیں دیکھا۔

جل جلالہ۔

آپ سوچئے کہ جن دینی مکاتب میں اس قسم کی تعلیم دی جائے وہاں سے نکلے ہوئے طالب العلم کس قسم کے دل و دماغ کے مالک ہوں گے اور وہ پھر اپنے حلقۂ تعلیم و تدریس اور وعظ و ارشاد میں کیا کیا توہم پرستیاں نہ پھیلائیں گے؟ اور جس قسم کا اسلام ان لوگوں کی طرف سے پیش کیا جائے گا، دنیائے علم و بصیرت اس کے متعلق کیا کہے گی۔؟

اور یہ بھی سوچئے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کو قرآنی حقائق سے دور کا بھی واسطہ ہو سکتا ہے؟

جشن نامے

ہم ہر سال جشنِ جمہوریہ منانے کی تیاریاں کرتے ہیں مگر کیا ہر جشن اسی طرح منایا جائے گا جیسے ہم ہر سال مناتے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے جشنوں کی تبسم نشاں درد انگیز تصویر۔

۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

سلسلۂ معارف القرآن (پرویز)

(قرآنی تعلیمات و تصورات کی وضاحت قرآنی آیات کی بنیاد پر)

۱۔ ابلیس و آدم

صفحات ۲۷۶۔ بڑی تقطیع (۲۹×۲۲/۸) مجلد مع گرد پوش۔ قیمت:۔ آٹھ روپے

مضامین:۔ انسانی تخلیق۔ نظریہ ارتقاء۔ قصہ آدم۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ ملائکہ۔ روح۔ وحی۔ رسالت

۲۔ جوئے نور

صفحات ۳۰۴۔ بڑی تقطیع (۲۹×۲۲/۸) مجلد گرد پوش قیمت چھ روپے

مضامین:۔ طوفان نوح۔ قوم عاد و ثمود۔ ناقۂ صالح۔ لقمان۔ ابراہیم خلیل اللہ۔ آتش نمرود۔ حضرات اسمٰعیل۔ اسحٰق۔ یعقوب۔ لوط۔ یوسف اور شعیب علیہم السلام۔

۳۔ برق طور

صفحات ۳۲۰۔ بڑی تقطیع (۲۹×۲۲/۸) مجلد مع گرد پوش۔ قیمت چھ روپے

مضامین:۔ حضرت موسیٰ۔ داستان بنی اسرائیل۔ تورات۔ کلیم الٰہی۔ قارون۔ ہامان۔ حقیقت خضر۔ واقعہ حضر سلطنت داؤدی۔ شوکت سلیمانی۔ حضرت ایوب۔ یونس۔ ادریس۔ الیاس۔ ذوالکفل علیہم السلام۔ قوم تبع اصحاب الاخدود والرس والحجر۔ یاجوج ماجوج اور ذوالقرنین۔

۴۔ معراج انسانیت

یعنی سیرت نبی اکرم قرآن کے آئینہ میں۔ صفحات ۸۳۲ بڑی تقطیع (۲۹×۲۲/۸) مجلد مع گرد پوش ڈبکس قیمت بیس روپے

مطالب:۔ ظہر الفساد۔ دنیائے مذاہب۔ دنیائے تہذیب۔ عرب کا حسن و قبح (۱۵۶ صفحات میں) بشارات طلوع آفتاب۔ قم فانذر۔ آویزش حق و باطل۔ استقامت۔ تشکیل جماعت۔ ہجرت۔ مرکز ملت (تحویل قبلہ) جہاد (چار ابواب میں) سلسلۂ غزوات۔ سلسلۂ دعوت و ارشاد اور تعلیم و تبلیغ۔ اسلامی نظام۔ معجزات۔ معراج۔ درون خانہ (عائلی اور معاشرتی زندگی) تکمیل کار۔ جہان نو۔ ختم نبوت۔

۵۔ انسان نے کیا سوچا؟

(دو ہزار سال میں انسانی فکر کا حاصل) صفحات ۳۶۸۔ بڑی تقطیع (۲۹×۲۲/۸) مجلد مع گرد پوش قیمت دس روپے

مسائل:۔ کائنات کیسے بنی۔ زندگی اور شعور کہاں سے آئے۔ کائنات کا مقصد۔ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ خیر و شر اور مستقل اقدار۔ علم کیسے اور کہاں سے حاصل ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں سیاسیات کا مقام۔ مملکت کا تصور۔ انفرادی ملکیت۔ مغربی تہذیب۔ انسانی فکر کا عجز وغیرہ وغیرہ

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۲۔ ایل (پی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

ادارہ طلوع اسلام

کراچی سے لاہور منتقل ہو رہا ہے

طلوع اسلام کنونشن (لاہور) نے قرارداد منظور کی تھی کہ طلوع اسلام کے پیش نظر مقصد کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ادارہ مستقل طور پر لاہور منتقل ہو جائے۔ اس وقت تک اس نقل مکانی کے لئے ضروری اسباب مہیا نہ ہو سکے۔ اب اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ارادہ یہ ہے کہ اپریل آئندہ میں ادارہ وہاں منتقل ہو جائے۔ چونکہ اس نقل مکانی کے سلسلہ میں دفتری کاروبار میں کچھ خلل واقع ہو گا اس لئے طے یہ کیا گیا ہے کہ کراچی سے ۳۰ مارچ کو اپریل اور مئی کا مشترکہ پرچہ شائع کر دیا جائے اور اس کے بعد جون کا پرچہ لاہور سے شائع کیا جائے۔ اپریل مئی کے پرچہ میں مزید تفاصیل اور لاہور میں ادارہ کا پتہ شائع کیا جائے گا۔ قارئین سے درخواست ہے کہ تعمیل طلب امور کے متعلق وہ ہمیں ۲۰ مارچ تک (کراچی کے پتہ پر) اطلاع دے دیں۔ تاکہ ان امور کے متعلق ضروری کارروائی اخیر مارچ تک عمل میں آجائے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۱۵۹/۳۔ ایل (پی ای سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی

قرآنی فکر کو اُجاگر کرنے والی کتابیں

(مصنفہ: علامہ پرویز)

۱۔ سلیم کے نام خطوط

صفحات ۴۰۸۔ تقطیع درمیانہ (۱۷×۲۷/۸) مجلد مع گردپوش۔ قیمت چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

اسلام کے متعلق نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا مدلل جواب اکیس خطوں میں۔ زبان سادہ شگفتہ اور دلنشین۔

عنوانات: ہماری نمازیں۔ روزے۔ اجتماعات۔ شادیاں۔ تہذیب وغیرہ۔ طلاق کا قرآنی مفہوم۔ نظام ربوبیت کمیونزم اور اسلام۔ صلوٰۃ و زکوٰۃ۔ مقام نبوت و رسالت۔ انسانی فطرت کچھ نہیں۔ انسانی صلاحیتیں اور اخلاق۔ خدا کا تصور۔ آزادی کا صحیح مفہوم۔

۲۔ فردوس گم گشتہ

صفحات ۱۶۴۔ تقطیع درمیانہ (۱۷×۲۷/۸) مجلد مع گردپوش۔ قیمت چھ روپے (علاوہ محصولڈاک)

پرویز صاحب کے انتیس ۲۹ مضامین کا مجموعہ جو زندگی کے اہم حقائق پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ایمان و عمل۔ عقائد مسلمان کی زندگی۔ عبادت۔ نجات۔ ثواب۔ زکوٰۃ نیز عیدالضحیٰ عیدالفطر۔ لیلۃ القدر اور معراج کی وضاحت۔

۳۔ اسباب زوال امت

صفحات ۱۷۶۔ تقطیع چھوٹی (۲۰×۳۰/۱۶) مجلد مع گردپوش۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصولڈاک)

آدم جنت میں تھا۔ ابلیس کا فریب کھا کر جنت سے نکالا گیا کیا وہ ——— دوبارہ جنت میں جا سکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہاں ——— اسلام دین یعنی نظام زندگی ہے ——— مذہب رسومات کے مجموعہ کا نام ہے دین کو مذہب بنا دینا باعث زوال امت ہے۔ امت کا عروج موجودہ مذہب کی جگہ دین کے قیام سے ہو سکتا ہے۔

اسباب زوال امت کا یہ تجزیہ مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی کامیاب کوشش ہے۔

——— اس پتہ سے منگوائیے ———

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۱۵۹/۳۔ ایل (پی ای سی ایچ سوسائٹی) کراچی ۲۹

انتہائی کم قیمت پر بہترین کپڑا

96000

- اعلیٰ درجہ کی سفید شرٹنگ
- مرغا چھاپ سفید شرٹنگ
- دل چھاپ ساٹن ڈرل وغیرہ وغیرہ

میسرز علی محمد اسمٰعیل S/A 39 مولجی جیٹھا مارکیٹ ــــ کراچی

نیز

اسٹال:- مل اونرز ریٹیل کلاتھ مارکیٹ۔ پرانی نمائش

بندر روڈ ایکس ٹینشن کراچی سے بھی مل سکتا ہے:

داؤد کاٹن ملز لمیٹڈ کراچی

پیشگی خریداران

یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا تھا۔ گذشتہ چار سال میں اکثر و بیشتر زرِ پیشگی کے عوض مطبوعات دی جا چکی ہیں اور متعلقہ کھاتوں میں یا تو کچھ باقی ہی نہیں رہا ہے یا آمد سے خرچ زائد ہو چکا ہے۔ زائد خرچ کی ادائیگی کے لئے فرداً فرداً یاددہانی کرائی جا چکی ہے۔

زرِ پیشگی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں قابلِ قدر مدد ملی ہے اس لئے اس سلسلہ کا جاری رکھنا بہمہ وجوہ مستحسن ہے۔ توقع ہے کہ جن احباب کا زرِ پیشگی ختم ہو چکا ہے وہ مزید ایک سو روپے یکمشت یا باقساط ارسال فرما کر اس مفید کام میں حصہ لیتے رہیں گے۔

قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب جو تاحال پیشگی خریدار نہیں بنے ہیں ان کی توجہ اس مفید سلسلے کی طرف منعطف کرائی جاتی ہے تاکہ وہ اس میں جلد از جلد شامل ہو جائیں۔

پیشگی خریدار بن کر آپ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں معتدبہ امداد کچھ خرچ کئے بغیر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس اسکیم کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک سو روپے کی رقم ادارہ کے پاس جمع کرا دیں۔ ادارہ اپنی مطبوعات (جنہیں آپ لینا پسند کریں) آپ کو گھر بیٹھے پہنچاتا رہے گا اور محصول ڈاک بھی اپنے پاس سے ادا کرے گا۔ اس طرح آپ کو آپ کے جمع کردہ روپیہ کی کتابیں (بلا محصول ڈاک) مل جائیں گی۔ اس میں ہمارا فائدہ صرف اتنا ہے کہ ہمیں کچھ رقم پیشگی مل جاتی ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۳/۱۵۹ ایل (پی ای سی ایچ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹